عشاق کے قافلے

19

بابا بزنجو

1917............11اگست1989

شاہ محمد مری

جملہ حقوق محفوظ

کتاب: بابا بزنجو

مصنف: شاہ محمد مری

اشاعت اول: جنوری2009

اشاعت دوم: جولائی2015

قیمت: 300روپے

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

مری لیب فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ

فون:081-2843358

ای میل:Editorsangat@sangat.net

ویب سائٹ:www.sangatacademy.net

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

*......بلوچ قومی عوامی تحریک کی گم نام سپاہی
اور میر غوث بخش بزنجو کی ماں

بی بی دُر بی بی، کے نام

جس کا بیٹا غوث بخش ایک برس کی عمر میں
یتیم ہوگیا......
اور اُس کی ساری پرورش اسی مہان خاتون
نے کی۔

*......بلوچ قومی عوامی تحریک کی گم نام سپاہی
اور بابا غوث بخش بزنجو کی باوفا بیگم

بی بی جان بی بی، کے نام

جس کے خاوند کو 25 برس تک اُس سے جدا
رکھا گیا،...........جیل میں۔

فہرست

پیش لفظ 8

1 پہلی ملاقات 13

2 ہیری گوانکے 17

3 ایک سال کا یتیم 20

4 کھیلو گے کودو گے، بنو گے بزنجو 25

5 علی گڑھ یونیورسٹی میں 27

6 شادی، خاندان 30

7 سیاست کی بھٹی، بلوچستان 31

8 سیاست، سیاست اور صرف سیاست 33

(i) بلوچ لیگ 34

(ii) قلات نیشنل پارٹی 34

(iii) آل انڈیا پیپلز کانفرنس 39

(iv) کمیونسٹ پارٹی 41

(v) بلوچستان مزدور پارٹی 42

9 آزاد بلوچستان 45

9.1 بلوچستان کا قومی پرچم 46

9.2 بلوچستان کا آئین 47

10 بلوچ پارلیمنٹ میں 50

11 بلوچستان پاکستان میں اور بزنجو جیل میں 57

12 مسلم لیگ کا چولا بھی پہن کر دیکھا 59

13 جیلیں ریلیں 61

14 اُستمان گل 62

15 پاکستان نیشنل پارٹی 65

16 نیشنل عوامی پارٹی 67

17 پیشانی پہ وال چاکنگ 68

18 پابندیاں شکنی 72

19 ناشکرے لوگ 76

20 چانسلر بزنجو 78

21 چاند پہ داغ 81

22 قیدی چانسلر 83

23 نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی 86

24 پاکستان نیشنل پارٹی 88

25 ضیاالحق 90

26 ایم آر ڈی 94

27 بزنجو کی سیاست کے خدوخال 96

27.1 بلوچ دوستی 99

27.2 سامراج دشمنی 100
27.3 بین الاقوامیت پسندی 101
27.4 شہنشاہیت مخالفت 103
27.5 سرقبیلوی نظام مخالفت 104
27.6 وفاقی نظام کے لیے 105
27.7 سیکولرازم کے لیے 109
27.8 عورتوں کے حقوق کے لیے 110
27.9 پارلیمانی جمہوریت کے لیے 111
27.10 سوشلزم کے لیے 112
27.11 منظّم عوامی پارٹی کی جستجو 114
27.12 بابائے مذاکرات 116
28 بزنجو کی لائبریری 118
29 شخصیت 122
29.1 بزنجو اور بچے 127
29.2 بطور استاد 128
29.3 بطور مقبول لیڈر 132
29.4 بطور شکست خوردہ لیڈر 133
29.5 لکھاری کے بطور 135
30 سکوتِ شاشان 136
31 بزنجو کی قبر 142
اختتامیہ
— بزنجو کا پاپاخ 145
حوالہ جات 150

پیش لفظ

وقت کے بڑے گھڑیال کا بڑا پہیہ اشیا' مظاہر اور مقامات کی ہیئت ، نام اور خصلتیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔قیقان ابھی حال ہی تک ایک اہم علاقہ ہوا کرتا تھا۔ بالخصوص عربوں نے اپنے عروج کے وقت یہاں کئی حملے کیے، کئی پسپائیاں بھگتیں ، اورکئی بار فتوحات سے سرشار ہوئے۔ قیقان بلوچوں کا مسکن تھا، ہے اور انشا اللہ رہے گا۔عرب فیوڈل حاکم اپنے قبائلی حصے کو اِدھراُدھر فتوحات پر لگائے رکھتے اور مالِ غنیمت (بہت نیچ کام ہے مگر اس لفظ کو تقدس عطا کیا ہے اردو نے) کواُن کا روزگار بنائے رکھتے تھے۔قیقان پر عرب اس لیے بھی لالچی تھے کہ یہاں کے گھوڑے بہت اعلیٰ نسل کے ہوا کرتے تھے۔گھوڑا سندھی زبان میں تو بے وقوف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر بلوچ گھوڑے خود بلوچوں کی تباہی کا باعث بھی بنے۔معاویہ سے لے کر(ہندوستانیوں، پنجابیوں کا ہیرو) محمد بن قاسم تک سارے حملہ گر قیقان کے ہمارے اِن گھوڑوں کی سرزمین کو ہتھیا لینے اپنی رالیں ٹپکاتے رہے۔(پتہ نہیں عربوں نے گھوڑے بازی کب اور کیوں چھوڑی اوراب باز اور شہباز کے فریفتہ کیوں اور کیسے ہوئے)۔عباسی خلیفوں کی فیوڈل حکمرانی کے دور تک قیقان عرب غاصبوں اور بلوچ مزاحمت کاروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں ہی میں رہا۔قیقان کے گھوڑے اور متصل علاقہ خضدار کی تلواریں اس خطے کو شہرت بخشتی رہیں۔حتیٰ کہ انگریز جاسوس پوٹنگر گھوڑوں کے سوداگر کے

روپ میں ہمارے وطن کی جاسوسی کرنے بھیجا گیا تھا۔گھوڑوں کا سوداگر یعنی ''ہارس ٹریڈر''۔ بہت عرصہ بعد بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں یہ کام یعنی ''ہارس ٹریڈنگ'' ایک باقاعدہ کاروبار بن گیا' جس میں اسمبلی کے ممبراب، اشرف المخلوقات نہ رہے بلکہ ''ہارس'' بن گئے اور وزیراعظم وغیرہ بننے کے خواہش مند پیسوں کی بوریاں (سوٹ کیس) لیے جہازوں سے اترتے چڑھتے رہے تاکہ اِن گھوڑوں کو خرید کر ان کا ووٹ حاصل کیا جائے۔ ہمارے اِس عہد میں لاہور کے دو بھائیوں نے اس شعبے میں خوب خوب نام کمایا۔ اور نہ چھوڑا ایم این اے ایم پی اے کو، نہ چھوڑا ناظم کاظم کو،..........حتیٰ کہ ججوں کو بھی گھوڑوں کا کاروباری بنا کر ہارس ٹریڈنگ کی صنعت کو چار چاند لگاتے رہے۔ وہ مشہور کیکان وقت کے دھندلکے میں بالآخر ''نال'' کا نام پا گیا جو کہ خضدار کے جنوب مشرق میں تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ چشموں کاریزوں کا مالک ہے۔مشہور پہاڑ اور اس کی بلند و سر بلند چوٹیاں یعنی کوہِ شاشان یہیں ہے۔

کیکان (نال) بلوچستان میں آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے بہت ہی اہم جگہ ہے۔ جہاں فرانسیسی ماہرین نے ایک پورا انسانی ڈھانچہ نکالا تھا جس کی پسلیوں میں کمان کا ایک تیر پیوست تھا۔ ایوبی آمریت بلوچستان سے بہت سا ''خیر'' بھگانے میں کامیاب ہوئی تھی، اُن میں سے ایک خیر، اِن فرانسیسی سائنس دانوں کی صورت بھی موجود تھا، جسے اس آمریت نے بھگا دیا۔

کیکان (نال) کی دوسری شہرت غوث بخش بزنجو کی کی وجہ سے تھی، جس نے ایشیا کی سیاست میں بہت اہم کردار ادا کیا......!!

بزنجو، بلوچ تہذیب و تاریخ کے ساتھ ابد تک اِس صورت جڑا رہے گا، جسے نظر انداز کبھی بھی نہ کیا جاسکے گا۔ وہ شخص مستقبل میں بہت دیر تک اچھے انسانوں کو اپنے بارے میں' اپنے نظریات و سیاست کے بارے میں، اور اُن کی روشنی میں اُس عہد کے درد کے بارے میں بڑے بڑے ہالوں کے اندر جمع کرواتا رہے گا۔ اپنی سوچ کے تسلسل میں چلنے والے اُس دور کے قافلے میں شامل کرواتا رہے گا۔ اور وہ ایسا صرف اور صرف اخلاقی قوت سے کرتا رہے گا۔ اپنا حق جتا کر۔ اس کے قافلے کو دوام ہے۔ اس کے پیروکاروں کو دوام ہے۔ اس کی پیروکاری کو دوام ہے۔ بلوچ قوم مستقبل بعید

تک حق وصداقت اور انسانی بقا و بہبود کے لیے جب بھی نبرد آزما رہے گی تو ایسا کرتے ہوئے وہ گویا اپنے ہم عصر ہیروؤں کی تکریم کر رہی ہوگی۔ مگر تب بھی وہ ماضی کے اپنے ہیروؤں اور لیڈروں کو فراموش نہیں کریں گے، جنھوں نے ان کی تاریخ کی مصیبت کی کچھ گھڑیوں میں اُن کی رہبری کی تھی، اُن کی جنگیں لڑی تھیں، کبھی اصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا تھا، اپنی آزادی قربان کی تھی اور ڈکٹیٹروں کے خلاف جدوجہد میں قلی کیمپ، شاہی قلعہ اور دیگر پست و بے عصمت اذیت گاہوں میں ناقابلِ تصور مصائب کا سامنا کیا تھا۔

بزنجو تو پھر بزنجو تھا۔ متوازن، مہربان اور بالغ فکر..........اس بڑے انسان نے چاہ بہار سے لے کر جھنگ تک اور نیم روز سے لے کر خان گڑھ تک ایک پورے برصغیر کی سیاست کی، ایک بے انت صحرا کی باغبانی کی۔ بالخصوص ستر کی دہائی میں افغانستان اور ایران میں عوامی اور جمہوری تبدیلیوں نے تو پورے خطے کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ بلوچ قوم براہِ راست اُن سے متاثر ہوئی' اس لیے کہ ایران میں بلوچستان ہے، افغانستان میں بلوچستان ہے اور پاکستان میں بلوچستان ہے۔ پھر کراچی سے لے کر ہیناب تک 750 میل کا ساحل پورے کا پورا بلوچ ہے۔ جو خود بھی نعمتوں سے بھرا ہوا ہے اور تیل بھرے بحری جہازوں کا بین الاقوامی راستہ بھی ہے۔ بلوچ نے زبردست طور پر متاثر ہونا ہی تھا۔ بزنجو کی دوربین نگاہوں نے بہت کچھ بھانپ لیا تھا اور اس کی بے پناہ ذہانت نے اپنے نظریے اور اپنی قوم کی بہت مناسب خدمت کی۔ ایک ذمہ دار قوم کی ذمہ دار قیادت کو ثابت کیا۔

اور پھر سوویت یونین کی تحلیل کی صورت جب پورا خطہ بربادی کے دہانے پہنچا تو اسی بزنجو کی پروقار شخصیت، سیاسی بصیرت اور مستقبل بین مزاج نے ساری پڑوسی لیڈرشپ اور دانش وروں کو متاثر کیا۔

ہم اِس کا پاک ذکر ضرور کریں گے، جو نہ ابتدا تھا، نہ ہی وہ آخری شخص تھا۔ بلکہ وہ تو خیر و نیکی کے کارواں میں سے ایک تھا۔ اچھے انسانوں کا ایسا کارواں جو نہ معلوم کب اور کہاں سے شروع ہوا اور ہوتا ہوتا میر یوسف عزیز مگسی تک پہنچا۔ اور وہاں سے نیکی کے اولمپک کی یہ مشعل' تقدیر نے

میر بزنجو کے ہاتھ میں تھما دی۔مگر پھر وہ محض کارواں میں موجود شخص نہ رہا، وہ تو ہمارے کارواں کا میر بنا۔

بزنجو کی پوری زندگی دو چار اخلاقی اصولوں کے گرد گھومتی رہی۔اس شخص نے سیاست میں، دوستی میں، رشتے داری میں کبھی دھوکا نہ کیا، کبھی دغا نہ کی۔دوسری بات یہ تھی کہ بزنجو ضمیر فروش شخص کبھی نہ رہا۔بزنجو اپنے قبیل کے دوسرے ساتھیوں ہی کی طرح کبھی دولت سے مرعوب نہ ہوا۔اور آخری دو باتوں میں ایک یہ تھی کہ یہ شخص آمروں کی طاقت و رعب سے کبھی نہیں کانپا۔اور یہ کہ اس کا دل بہت درد بھرا تھا۔انسانوں کے لیے اُس کا دل کڑھتا تھا۔اس کا تعلق لوگوں کے دکھ درد میں لاتعلق نہیں رہتا تھا۔

شائستہ لب و لہجے کے مالک بزنجو نے بہت سنجیدگی سے اپنے عہد کے بلوچستان، اور اس کے پڑوس کا جائزہ لیا۔سچ کو تلاش کیا اور اسے بنی نوعِ انسان میں بانٹنے کا عہد کیا۔سچ کے ساتھ سچے انداز میں جڑے رہنے کے لیے لیا ہوا حلف، بزنجو نے ساری عمر نبھائے رکھا۔اُس نے سچ کے ساتھ سچا رہنے کی تصدیق موت سے قبل عوام سے چاہی تھی اور کروڑوں نے اس کی تصدیق کی۔

بزنجو نے بلوچستان کو انسانی دوستی سکھائی۔ بلوچستان دوستی سکھائی، بلوچ دوستی سکھائی۔جن لوگوں کے لیے شاہ لطیف کا درجِ ذیل شعر صادق آتا ہے، اُن لوگوں میں میر غوث بخش بزنجو حتماً شامل ہے۔

میں پنہوں کے پاؤں کی، پلکوں جھاڑوں دھول
باندی بنوں بلوچ کی، جاؤں سب کچھ بھول

بزنجو کا یہ زریں قول کس قدر سچا تھا:

''میں نے تمام عمر اپنے وطن اور اس میں بسنے والوں سے عشق کیا ہے''۔

بزنجو نے اُس ٹکڑے میں انسانی فلاح کا کام کیا، جسے بلوچستان کہتے ہیں۔اور اُن جگہوں، علاقوں ٹکڑوں کے بزنجوؤں سے کامریڈی کی جو اپنے اپنے ٹکڑوں میں بزنجو گیری کر رہے تھے۔

آج ہم عوام کے حقیقی ساتھی اور اپنے ہیرو جناب غوث بخش بزنجو کو عقیدت کا خراج پیش کرنے قلم اٹھائے ہوئے ہیں۔کل ہم شہ مرید کے لیے لکھیں اور بولیں گے۔پھر توکلی مست کے لیے، بابو، عبدالکریم امن کے لیے، قاضی داد محمد اور نسیم تلوی کے لیے، اسلم اچکزئی، عبدالصمد خان اور ہاشم غلزئی کے لیے یہی محبت کے پھول نچھاور کریں گے۔ہیرو تو وہ ہے' جس نے محبت کے گیت گائے ہوں، امن کا درس دیا ہو، ترقی اور خوش حالی کی شاہراہ کو اختیار کیا ہو۔عوام کے ہیرو تیس سالہ خانہ جنگی برپا کرنے والے نہ تھے۔اور نہ ہی بلوچ کا ہیرو دہلی پر حملہ کرنے والا ہے، بلکہ ہمارا ہیرو میر غوث بخش بزنجو ہے جس نے سیاست میں روشن خیالی، عوام دوستی اور بین الاقوامیت کا راستہ اختیار کر کے اپنی پوری حیاتی لگا دی۔

شاہ محمد مری

ماوند

29جنوری2009

1

پہلی ملاقات

بزنجو صاحب کو میں نے سب سے پہلے سبی کے ایک جلسہِ عام میں دیکھا، جہاں میں کالج میں پڑھتا تھا۔مگر وہ کوئی ملاقات نہ تھی بلکہ محض ایک سامع کی حیثیت سے ایک مقرر کو سننے کا تجسس تھا!۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نیشنل عوامی پارٹی زوروں پہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لوگ اس جلسے کے لیے ٹولیوں کی شکل میں جلوس نکالے آ رہے تھے۔ میرا جلوسوں سے بھی واسطہ یہیں پہلی بار پڑا تھا۔ دلچسپ بات اس جلوس کی یہ تھی کہ جلوس کے چار طے شدہ نعرے تھے؛ نیشنل عوامی پارٹی زندہ باد، خان عبدالولی خان زندہ باد، مہنگائی ختم کردو، چور بازاری بند کردو۔ جلوس کے پچھواڑے میں ہمارے اپنے مری قبیلے کے کچھ لوگ بھی اپنی پگڑیوں، مویشی بانی والی چادر اور لاٹھی کے ساتھ جلوس والے نعرے لگا رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کوہستان سے سودا سلف خریدنے کے لیے آئے ہوئے اِن پاک قبائلیوں نے نعروں کا کس طرح ستیاناس کیا ہوا تھا۔ نعرہ باز کہتا: نیشنل عوامی پارٹی، میرے قبائلی کہتے: ''بند کردو''۔ وہ کہتا: خان عبدالولی خان۔ مری کہتے''ختم کردو''۔ مہنگائی: زندہ باد، چور بازاری: زندہ باد

اس وقت تک نہ بزنجو میرا لیڈر تھا اور نہ میں اس کا پیروکار تھا۔ میں اُسی کالج کے زمانے یعنی 1972 میں روشن فکر سیاست سے شناسا اور پھر منسلک ہو گیا۔مگر بلوچستان میں روشن فکری کے پیر، غوث بخش سے قریب آنے میں مجھے مزید چھ برس لگ گئے کہ بزنجو تو سیاست کے سب ٹھکانوں میں بسیرا کرتا رہا۔ گورنری سے لے کر حیدرآباد جیل تک .... اور میں ایک نوآموز، نہ یہاں تھا نہ وہاں۔

پھر، 1978 میں جب افغان انقلاب ہو گیا تو بزنجو صاحب اس انقلاب کا محافظ بن کر میدان میں کودا۔ معمر بزنجو پہ خدا ہمیشہ یوں مہربان رہا کہ وہ نئی سے نئی حقیقت کو سب سے پہلے اور بہت جلد دیکھ لیتا تھا' جان جاتا تھا' اور تسلیم کرتا تھا۔ چنانچہ وہ پاکستان بھر میں اُن اولین پارلیمانی سیاستدانوں میں سے ایک تھا جنھوں نے افغان انقلاب کو گلے لگا کر خیر مقدم کیا۔ افغان انقلاب نے امریکہ و پاکستان کی مداخلت اور اندرونی انقلاب دشمنوں کی کارستانیوں کے نتیجے میں جتنی بھی ٹھوکریں کھائیں، جتنی بھی اونچ نیچ دیکھی' جتنے بھی جھٹکے کھائے' بزنجو اُن سب سے بے نیاز' ثور انقلاب کے زور آور ہونے اور اس کو مضبوط کرنے کے کام میں جُتا رہا۔ اس نے اس انقلاب کے حق میں ہر فورم سے کام لیا۔

انقلاب کے لیے بزنجو کی مدد اور حمایت محض پڑوسی گیری کی وجہ سے نہ تھی، نہ محض اس لیے تھی کہ افغانستان میں پاکستانی بلوچستان کا تین چوتھائی جتنا بڑا بلوچستان ہے جہاں پانچ لاکھ بلوچ رہتے تھے............ بلکہ وہ اس انقلاب کا ساتھ صرف اس لیے دیتا رہا کہ وہ انقلاب مزدوروں کسانوں اور دیگر مظلوم طبقات اور دربدر قوموں کا انقلاب تھا۔

میر غوث بخش بزنجو اپنے اس انٹرنیشنلسٹ فریضے کی ادائیگی صرف بلوچستان میں نہیں کرتا رہا۔ وہ تو بلوچستان کے باہر بھی، حتیٰ کہ ملک سے بھی باہر جا کر اس انقلاب کے حق میں رائے ہموار کرتا تھا۔ ''جنگ'' لاہور کے زیرِ اہتمام افغانستان کے مسئلے پر ایک سیمینار میں اس کی تقریر کا ایک ہی پیراگراف ہمیں بتائے گا کہ اس کی سوچ تھی کیا:

''......افغانستان میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ افغانستان میں افلاس، بھوک ناداری،

جاگیردارانہ اور قبائلی گرفت تھی۔ان حالات نے افغانستان میں ایک شعور پیدا کیا جس کے نتیجے میں بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی جماعتیں بنیں اور یہ محرومی اس حد تک بڑھی کہ ایک تبدیلی کا تقاضا ہوا۔معاشی و معاشرتی دباؤ کے تقاضے کو شاہی خاندان کی ایک سرکردہ شخصیت داؤد خان نے خلق جماعت کے ساتھ مل کر پورا کیا۔اس نے بڑے پرامن طریقے سے بادشاہت کو ختم کیا اور وہاں جمہوریت کے لیے جگہ بنائی۔......اس میں کوئی شک نہیں کہ داؤد خان نے ایک صدی پرانی بفرسٹیٹ کی حیثیت کا جو تقدس تھا اس کو توڑا۔افغانستان کی آزادی اور کچھ نہیں اس کا دارو مدار محض اس لیے تھا کہ چوں کہ وہ زار سلطنت اور انگریزی سلطنت کے درمیان بفرسٹیٹ تھا......تاریخ کے کسی دور میں بھی افغانستان میں کوئی ایسی حکومت وجود میں نہیں آئی جس نے سوویت یونین کی مخالفت کی ہو......''۔

داؤد خان نے یہی تو غلطی کی تھی اور پاکستان، سعودی اور ایران جیسے ممالک اور اُن کے مالک، امریکہ سے یاری بڑھانے کے لیے افغانستان میں خلق پارٹی پر کاروائی کی جس نے پھر اُسے، اس کی حکومت کو اور اُس کے پورے استحصالی نظام کو ختم کر دیا اور ایک عوامی حکومت بنا ڈالی۔

یہ بہت دلچسپ اور قابلِ فخر بات ہے کہ بلوچ بزنجو کا 'پشتون ولی خان سے اختلاف ہی افغان انقلاب پر خان کے رویے کی وجہ سے پیدا ہوا۔بزنجو بابا ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ وہ رشتے کی بنیاد کی بجائے نظریات کی بنیاد پر نور محمد ترہ کی کی حمایت کرتا ہے۔بغیر کسی لسانی، نسلی، مالی تعلق کی بنا پر .... بزنجو نے افغان انقلاب کے دفاع کے لیے وہ وہ کچھ کیا، جو پوری سوویت فوج نہ کر سکتی تھی۔بزنجو کی انقلاب دوستی قابلِ رشک تھی۔

اور ہم؟۔ہم تو خیر اس انقلاب کے اصلی مجاور تھے کہ یہ وہاں کی محنت کش پارٹی کا برپا کردہ تھا۔ہم نے ایمان کی طرح اس انقلاب کو زیست کا حصہ بنا ڈالا۔اور چوں کہ یہ انقلاب روزِ اول سے پاکستان کے بشمول بیرونی سامراجی قوتوں کی سازشوں اور مداخلتوں کا نشانہ رہا، اس لیے اس انقلاب کی حفاظت ہی پورے خطے کے انقلابیوں کی واحد ترجیح بنی، اور بنی رہی۔اب چوں کہ بزنجو صاحب

بھی اس انقلاب کی طرف داری میں جتا نظر آیا۔اس لیے وہ اور اس کی پارٹی اپنے تمام تر داخلی خامیوں خرابیوں کے باوجود کچھ کچھ قابلِ برداشت بن گیا۔اس کے ہاں آمد و رفت شروع ہوئی۔

عملی سیاست (یعنی دفاعِ افغان انقلاب) میں شراکت داری نے قربت پیدا کی تو معلوم ہوا کہ عملی طور پر بزنجو صاحب معروضی سیاست کی مجبوری کے باوجود دل کے کسی دور دراز کے کونے میں فیوڈل ازم کی داخلی کارستانیوں کے ساتھ سو فیصد متفق نہیں ہے۔مجھے محسوس ہوا کہ بلوچستان میں انقلاب و قوم پرستی کے کئی بزنجوئی تھانیدار دراصل بزنجو کے ساتھی نہیں تھے۔بزنجو سے بلوچ کا ترجمان بن کر دراصل فیوڈل ازم کی داخلی سڑاند سے آگاہی نہ کرنے دینے کے دبیز پردے کا کام لیا جا رہا تھا۔

کیلنڈر نے ہماری تقدیر میں اسی بزنجو کی زندگانی کے آخری دس برسوں اور اس کے انتقال کے بعد اور شاید خود اپنے مرگ تک، اُس کی برخورداری لکھ دی۔

2

ہَیری گوانکے

بلوچ کے ہاں بیٹے کی پیدائش پر بندوق کی (ایک یا زیادہ) ہوائی فائر کی جاتی ہے اور زور زور سے پکار کر کہا جاتا ہے: ''ہَیر ی گوانکے' فلانی لوغا چوروے بیثہ (خیر کی پکار ہے، فلاں کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے)''۔ اور پھر مٹھائی بٹتی ہے اور جشن ہوتا ہے ،یعنی گوشت خوری۔ بزنجو کا تو سرداری گھرانہ تھا۔ضرور بڑے پیمانے پہ اس مسرت کا جشن منایا گیا ہوگا۔مگر ہم میں سے کوئی بھی اسے بزنجو صاحب سے پوچھ کر نوٹ نہ کرسکا۔اس لیے کہ دوسروں نے اس بارے میں لکھنا اہم نہ سمجھا اور راقم اتنا باریک بین کب رہا!۔

میں سوچتا ہوں کہ یہ تو بالکل بھی ضروری نہیں کہ بڑے انسان صرف بڑے بڑے ثقافتی شہری مراکز میں پیدا ہوتے ہوں۔ بڑا پن بھلا کب جغرافیہ کامحتاج ہوا ہے۔ ہر سماج اپنے معروض کے مطابق اپنا بڑا شخص پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا غوث بخش پیرس ،لندن اور نیویارک حتیٰ کہ کراچی لاہور میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ تو کوئٹہ میں بھی نہیں پیدا ہوا۔ وہ وہاں سے بھی تین سوکلومیٹر دور ریاست قلات میں چند جھونپڑوں اور گنے چنے کچے مکانات پر مشتمل ایک نام نہاد

گاؤں ''شانک'' میں پیدا ہوا۔

شانک بلوچستان میں موجودہ ضلع آواران کے جھاؤ کے علاقہ میں واقع ہے، جب کہ میر صاحب کا گھر تو زندگی بھر نال میں رہا ہے اور وہ وہیں پہ مدفون ہے۔اور یہ نال تو اِدھر مشرق میں ضلع خضدار میں واقع ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کا بقیہ قبیلہ تو رہتا تھا نال میں مگر اُس کا والد اپنی فیملی کے ساتھ شانک میں رہتا تھا۔میر صاحب کے خاندان کی ضلع آواران کے شانک سے ضلع خضدار کے نال کو منتقلی کی وجہ یہ ہے کہ میرؔ ابھی شیر خوار بچہ ہی تھا کہ وہاں طاعون کی وبا پھیلی تھی ۔لہٰذا پورا گھرانہ نال منتقل ہوا...........اُسے سرفرازی بخشنے!!

اس کی پیدائش کا سال کسی اور کو بھولے نہ بھولے، کمیونسٹوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔اس لیے کہ وہ اُسی برس پیدا ہوا جب انسانی تاریخ میں اولین سوشلسٹ ملک کی پیدائش کا ''ھیری گوانک'' گونجا تھا، بندوق نہیں بلکہ ''ارورا'' نامی توپ چلنے کی آواز کے ساتھ۔ جی ہاں......روس میں انقلاب آیا تھا' 1917 کو۔ دسمبر، ہمارے بزنجو کا ماہِ پیدائش ہے۔

میر صاحب ایک ایسے تاریخی دور کی پیداوار تھا، جب دنیا بھر میں عالمی پرولتاری اور قومی آزادی کی تحریکیں مظلوم ومحکوم اقوام اور کچلے ہوئے طبقات کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔

بزنجو لفظ بیزن سے نکلا ہے۔ جو فردوسی کی کتاب ''شاہ نامہ'' کی ایک مشہور داستان کا ہیرو ہے۔ یہ نام نہیں ہے بلکہ ''میر بیزن'' ایک خطاب ہے، جو کسی حکمران نے میر صاحب کے اجداد میں سے کسی سردار کو دیا تھا۔ یہی بیزن آگے جا کر پورے قبیلے پر فٹ آ گیا اور پورا قبیلہ بزنجو کے نام سے مشہور ہوا۔میر حمّل خان اُس کا جدِ امجد ہے۔ بزنجو کے دادا کا نام سردار فقیر محمد بزنجو تھا۔ وہ 1839 میں خان محراب خان حکومت میں مکران کا گورنر تھا۔ (اُس دور میں گورنر کو ''خان کا نائب'' کہتے تھے)۔ وہ 1883 میں وہیں فوت ہوا اور تقریباً 45 برس گورنر رہا(1)۔اسی وجہ سے مکران میں بزنجو قبیلہ کی رشتہ داریوں نے میر غوث بخش بزنجو کی سماجی اور سیاسی قدر و منزلت بڑھائی۔ واضح رہے کہ سردار فقیر محمد کی والدہ گچکی خاندان سے تھی۔

دراصل، والد کی بجائے غوث بخش بزنجو کا اپنا نام سفر خان ہونا چاہیے تھا کہ والد کی

بجائے اُس کی تقدیر میں زندگی بھر سفر کرتے رہنا لکھا تھا؛ اِس جیل کا سفر، اُس ریل کی مسافت............ابھی ابھی دہلی، ابھی ماسکو؛ مشرقی یورپ، مغربی یورپ۔ اور پھر بلوچستان کے اندر سیاسی دوروں کے ہزاروں میل کی آمد و رفت۔ سواری تو کبھی اُس کا مسئلہ نہ رہی۔ اونٹوں پہ جھونپڑی تا جھونپڑی کا سفر، ریلوں پہ جیلوں کے مابین سفر، جہازوں پر براعظموں کے مابین سفر............کشتیوں میں بلوچ جزیروں کے بیچ کا سفر۔............بلوچوں میں اور خصوصاً بلوچ سیاست دانوں میں اتنے زیادہ سفر شاید ہی کسی نے کیے ہوں۔

کہتے ہیں کہ کسی بزرگ کے کہنے پر والدین نے بچے کا نام غوث بخش رکھا تھا۔ میر غوث بخش، باپ کی طرف سے بزنجو قبیلے کے حملاڑی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ البتہ ماں کی طرف سے وہ بلیدی تھا جو کہ ایرانی بلوچستان میں موضع واسک میں رہتے ہیں (2)۔ میر صاحب کی والدہ کا نام بی بی دُربی بی تھا۔ (3)

اُس کے دو بھائی تھے اور ایک بڑی ہمشیرہ۔ ایک بھائی جنگ میں مارا گیا اور دوسرا طبعی موت مرا۔

3

ایک سال کا یتیم

ہفت آسمان جسے کچھ بنانا چاہتے ہوں، اُسے وہ شروع سے ہی گود لے لیتے ہیں۔ فطرت اپنی تلخیاں گھول گھول کے اپنے چُنے ہوئے لوگوں کو پلاتی جاتی ہے، اور اُس کے سر پر اپنا سایہ کرنے کے لیے دوسرے سارے سائے پھاڑ پھینکتی ہے۔ بزنجو کے ساتھ یہی ہوا۔ وہ ایک سال کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔

ایک قبائلی معاشرے میں کسی ایسے یتیم بچے کے لیے زندگی بسر کرنا آسان بات نہیں ہوتی جس کے پاس کافی جائیداد بھی موجود ہو، اور اس کے چھیننے والے بھی طاقت ور ہوں۔ بزنجو کی والدہ کی دلاورانہ مدافعت کے باوجود اس ننھے بچے کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ جائیداد پر چیلیں اور گدھ منڈلانے لگے، اس کی زمین نوچتے رہے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو گھر کل تک سارے علاقے میں ممتاز اور آسودہ تھا، اُس کے باسی اب نان شبینہ کے محتاج ہو گئے۔ (4) تیرا، کو، میرا، بنانے کے اس وحشیانہ عمل نے اس معصوم بچے کو مجبور کیا کہ بڑا ہو کر تیرا، اور، میرا کے سارے چکر کو ہی ختم کرنے کی جدوجہد میں لگ جائے۔ جائیداد بچانے کے لیے اس ننھے کی ماں کو وہ جتن کرنے

پڑے کہ اُسے قائل ہونا پڑا کہ ''جائیداد گناہ ہے''۔

تاریخ کے کس کس یتیم کا ذکر کیا جائے۔ تلخی تو ہوچی منہ کی زندگانی میں بھی بھر دی گئی تھی، اور ترہ کئی کی حیات میں بھی۔ انھی تلخیوں کی تربیت ہی میں کسی کو نبی بننا ہوتا ہے، کسی کو ''کیپٹل'' کا مصنف اور کسی کو بابائے بلوچستان۔ عجیب تربیت گاہ ہے دنیا!!

اور پھر فطرت کا دوسرا پینترا دیکھیے: اس نے 1922 میں پولیٹیکل ایجنٹ قلات کرنل کیس اور بلوچستان میں مشنری تحریک کے سربراہ ڈاکٹر ہنری ہالینڈ کو غلامی کی رسم کو ختم کرنے کی نوید سنانے مکران بھیجا۔ اس سلسلے میں بیلہ سے مکران جاتے ہوئے کرنل کیس جھاؤ میں سے گزرا۔

واضح رہے کہ ریاست قلات میں 23-1922 تک غلامی قانوناً رائج تھی اور شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی کے ساتھ باقاعدہ غلام اور باندیاں دی جاتی تھیں۔ اُس زمانے میں بلوچستان کے اندر غلامی اپنی کلاسیکل صورت میں موجود تھی۔ مرد و زن غلام رکھنا، خریدنا، بیچنا، اور تحفے میں دینا لینا عام بات تھی۔ رتبے کے لحاظ سے ہر بڑا خاندان غلاموں کا آقا ہوتا تھا۔

دوسرا تباہ حال طبقہ کسان طبقہ، ہوا کرتا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ کسان (بزگر) کو خریدا بیچا نہ جاتا تھا۔ کام کے لحاظ سے دونوں ایک ہی طرح تھے۔ کھیت میں مشقت کے علاوہ بھی اُن سے ہر کام لیا جاتا تھا۔ پیداوار پہلے تو ہوتی ہی کم تھی، اوپر سے طرح طرح کی کٹوتیاں کر کر کے آقا اُسے قلاش کر جاتا اور اگلی فصل تک اسے قرضوں کے بوجھ تلے اَدھ موا کرتا تھا۔

چوں کہ کرنسی وغیرہ کا رواج نہ تھا، اس لیے ہر طرح کی خرید و فروخت، قرض و تحفہ غلے کی صورت دیا، لیا جاتا۔

چھوڑیے غلامی کو، آیئے یتیمی کی طرف۔ ماں نے کم سن بزنجو کو پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ جس نے اُس کی روئیداد سنی اور ایک ''کورٹ آف وارڈ'' مقرر کر دیا، جس نے میر صاحب کی زمینی جائیداد کا چارج لے لیا۔ یوں غلامی ختم ہونے کے موقع پر دوسرا بڑا واقعہ یہ ہوا کہ ایک یتیم کی جائیداد ہڑپ ہونے سے بچ گئی۔ کس نے بچائی؟ انگریز نے۔ اُس انگریز نے، جس نے خود پورے وطن کو ہڑپ کر رکھا تھا۔ اور بزنجو نے اُسی کے خلاف تو بڑا ہو کر لڑنا تھا۔ پی اے

نے اُسے فوراً آواران منتقل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کا خاندان جھاؤ سے آواران منتقل ہو گیا۔

پولیٹیکل ایجنٹ کی اس دلچسپی میں انسانی ہمدردی بھی شامل تھی، اس کے علاوہ یہ اس کے فرائضِ منصبی کا بھی تقاضا تھا۔ اُن دنوں سردار خیل کے تمام مسائل کا تعلق اور ذمہ داری انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے فرائض میں شامل ہوا کرتی تھی۔ یہ اختیار پولیٹیکل ایجنٹ کو معاہدہ 1872 کے ذریعے حاصل تھا، جو خان قلات اور سلطنت برطانیہ کے درمیان ہوا تھا۔

چھ سات ماہ کے اندر اندر پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف سے حکم آیا کہ اُس کی تمام جائیداد حکومت نے کورٹ آف وارڈ میں لے لی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جائیداد حکومت سنبھالے گی اور آمدن کو بچے اور خاندان پر خرچ کرتی رہے گی، بچے کے بالغ ہونے تک۔ ہمارے نواب خیر بخش مری کے ساتھ بھی یہی ہوا اور نواب اکبر خان بگٹی کے ساتھ بھی۔ انگریز بہت ظالم سہی مگر وہ یتیم کی آمدن میں کرپشن نہ کرتا تھا (مگر صرف سردار کے یتیم بچے کی)۔ چنانچہ کم سن غوث بخش کو معہ افرادِ خانہ کوئٹہ منتقل کرنے کا حکم ہوا۔ اس طرح 1923 کے آخر میں وہ کوئٹہ منتقل ہوا۔

کرنل کیس کی اِس کوششوں کا فائدہ یہ ہوا کہ نہ صرف کم سن بچے کی جائیداد محفوظ ہو گئی بلکہ وہ کوئٹہ، کراچی اور بعد میں علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے قابل بھی بن سکا۔ کم سن غوث بخش اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ہمراہ کوئٹہ آیا، جہاں اُسے سنڈیمن ہائی سکول میں داخل کرایا گیا۔ یہ لوگ کوئٹہ کے بابو محلّہ میں رہنے لگے۔

اس کی پرورش اس کی والدہ نے کی۔ اور کیا کمال پرورش کی۔ ایک بار ملتان کے عمر کمال ایڈووکیٹ کو بزنجو صاحب نے بتایا تھا کہ ''والدہ نے بچپن ہی میں مجھ میں بلوچیت کے جراثیم پیدا کر دیے۔ اس نے قصے کہانیوں کے ذریعے مجھے بلوچ تاریخ اور رسم و رواج سے واقف کرایا''۔

اب فطرت کی اگلی دلچسپ کارستانی دیکھیے؛ سکول کے دوران غوث بخش کو فٹ بال سے وابستگی پیدا ہوئی اور ساتویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے وہ سنڈیمن ٹیم کا باقاعدہ ممبر بنا، جو ایشیا کی بہترین ٹیم تھی۔ ''اس ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے میں نے دور دراز کلکتہ میں اور پنجاب کی کچھ جگہوں میں ٹورنامنٹ کھیلے''۔(5) عبداللہ جان جمالدینی کے بقول وہ اس زمانے میں ''غوثی'' کے نام سے

مشہور تھا۔نکر، لمبے موزے اور فٹ بال کے شوز پہنے وہ کھیل کے میدان جاتا تو بہت چست اور بااعتماد لگتا۔اس لباس کے ساتھ ساتھ وہ سر پر کلاہ اور لنگی پہنتا تھا۔اس لیے کہ ان دنوں ننگے سر کوئی بھی نہیں پھرا کرتا تھا۔(6)

کوئٹہ شفٹ ہونے کے بارہ برس بعد 1935 میں جب بلوچستان کا تباہ کن زلزلہ آیا تو اس وقت میر بزنجو آٹھویں کلاس میں تھا۔(7)اس زلزلے کی وجہ سے بڑی تباہ کاریاں ہوئیں۔لوگ ہزاروں کی تعداد میں مرے۔قبریں کھودنے کو لوگ نہ تھے۔قبر کا کوئی تصور نہ رہا۔دس دس، پچاس پچاس لاشوں کو، جو بھی ملبے سے نکل سکیں، اجتماعی قبروں میں دفن کیا گیا۔بزنجو خاندان البتہ سلامت رہا۔زلزلہ زدگان (پوراشہر) کے لیے سرکار نے ریس کورس گراؤنڈ میں امدادی کیمپ لگادیے۔بزنجو اور اہلِ خانہ بھی اس کیمپ میں شفٹ ہوئے۔اور آرمی والوں کی طرف سے دال اور دو دو چپاتیاں کھانے لگے۔غوثی تین دن وہاں رہا۔زلزلے میں چوں کہ ریلوے لائن سلامت رہی تھی،اس لیے لوگوں کو سپیشل ٹرینوں کے ذریعے نکال لیا گیا۔چنانچہ بزنجو کو کراچی منتقل کر دیا گیا، جہاں اسے سندھ مدرسہ میں داخل کرایا گیا۔بابا نے وہیں اپنی تعلیم جاری رکھی۔

اس کی پیدائش سے لے کر 1936 میں سندھ مدرسے میں اُس کے داخلے تک کے عہد کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ عہد ہے جب مغربی یورپ جاگیردارانہ سماج کو توڑ کر صنعتی دور میں داخل ہوا تھا۔نوآبادیاتی نظام گر رہا تھا۔آزاد اور خودمختار قومی ریاستیں وجود میں آرہی تھیں۔ہر جگہ جاگیرداریت کی جگہ روشن فکر اور جمہوری اقدار پنپ رہے تھے۔انقلابی جمہوری جنگیں لڑی جارہی تھیں۔یہ ایک ایسا دور تھا جب دنیا کے ایک وسیع حصے اور مشرقی یورپ کو متاثر کرتا ہوا سوشلسٹ سوویت یونین دنیا بھر کے محنت کشوں،ضعیفوں، کمزوروں کے لیے امید کا سہارا بن چکا تھا۔

اور یہی وہ زمانہ تھا جب آزادی کی تحریک ہمارے اپنے خطے میں چل رہی تھی۔انڈین نیشنل کانگریس، کمیونسٹ پارٹی اور خود بلوچستان میں یوسف عزیز مگسی اور عبدالعزیز کرد کا روشن کردہ چراغ،ایک مشعل بن چکا تھا۔

وقت بھی اپنی تقسیم، عجیب انداز اور ناموں کے ساتھ کرتا رہتا ہے............منحوس زمانہ، خوش بخت زمانہ، اچھا زمانہ برا زمانہ، کاہل عہد، متحرک دور، مستی و خوش حالی کا زمانہ، قحط کا زمانہ............ بزنجو ایک خوش قسمت دور سے گزر رہا تھا، جہاں اُسے بقیہ زندگانی بسر کرنے کا سانچہ مل چکا تھا؛ سیاسی سانچہ، سامراج دشمنی، وطن دوستی اور سوشلزم کا سانچہ' جس میں ڈھل کر یتیم نے دیدہ وری پائی تھی......سیاست کی ولایت لینی تھی اور بلوچوں کے علاوہ ہزاروں محکوموں کی امیدوں کا مرکز بننا تھا۔

4

کھیلو گے کُودو گے' بنو گے بزنجو

بچپن میں ہمارے اساتذہ تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ہمیشہ یہ مقولہ دُہراتے رہتے تھے:

پڑھو گے لکھو گے، بنو گے نواب

کھیلو گے کودو گے، بنو گے خراب

کتنا غیر انسانی نعرہ تھا یہ؟۔ گویا تعلیم حاصل کرو نواب بننے کے لیے!!۔ لیکن اُس زمانے میں نواب شاید زیادہ انسان دوست' ہمدرد اور کام آنے والا ہوتا تھا۔ یہ مقولہ اب تو بالکل بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ آج کے زمانے میں تعلیم تعلیم نہ رہی، صرف ڈگری لینا رہ گیا ہے۔ کوئی عقل نہیں دینی، کوئی تربیت نہیں کرنی، کوئی انسانیت نہیں سکھانی............بس ڈگری دینی ہے۔ (اور ''ڈگری ڈگری ہوتی ہے!'')۔ جتنا بڑا ادارہ ہوگا، اتنا بڑا غیر انسانی نوجوان بنائے گا۔ پیسے کا بھوکا، جاہ کا طالب، دوسروں کو کہنیاں مار مار کر اپنا راستہ بناتا اعلیٰ تعلیم یافتہ!!۔ مگر خود بزنجو صاحب کے زمانے میں جہاں تعلیم ہوتی تھی، علم ہوتا تھا، تربیت ہوتی تھی، وہاں بھی اِس مقولے کو میر غوث بخش بزنجو

نے توڑ ڈالا۔ بلاشبہ اس نے پڑھا بھی، لکھا بھی۔ مگر ساتھ ساتھ کھیلا بھی کُودا بھی............اور یہی کھیل اور کُود اُس کے علم کا ذریعہ بنا۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ نوجوان کس طرح مروج قوانین کو بدلتا آگے بڑھتا ہے۔

1935 میں علی گڑھ کی فٹ بال ٹیم این ای ڈی کالج کے خلاف فٹ بال میچ کھیلنے کراچی آئی ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں این ای ڈی کالج کی ٹیم میں کوئی خاص کھلاڑی نہ تھے۔ انھیں اچھے کھلاڑیوں کی سخت ضرورت تھی۔ اِدھر بزنجو کے ایک سکھ دوست نے اس سے کہا کہ وہ این ای ڈی کالج کی طرف سے کھیلے۔ طلب اور رسد نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور یوں بہت مشہور کھلاڑی، غوثی ٹیم میں شامل ہوگیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی مضبوط ٹیم کے مقابلے میں وہ میچ برابر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ واضح رہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر جناب ڈاکٹر ضیاالدین بھی ان دنوں کراچی آیا ہوا تھا تاکہ مختلف بڑے گھرانوں کے لوگوں کو اپنے بچے علی گڑھ بھیجنے کے لیے آمادہ کرے۔ بزنجو صاحب کا اتنا شاندار کھیل دیکھ کر علی گڑھ یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کے سارے اراکین نے ڈاکٹر صاحب کے پاس جاکر بزنجو صاحب کو علی گڑھ لے جانے پر اصرار کیا۔ کچھ دیر بحث مباحثہ، انکار اقرار کے بعد وائس چانسلر نے اسے، کھلاڑی کے شعبے سے، اپنے کالج میں داخلہ دے دیا۔(8)

نہ درخواست نہ فارم۔ نہ ڈاک نہ خرچہ۔ بزنجو کو علی گڑھ میں داخل کرنے وائس چانسلر خود چلا آیا۔ اور علی گڑھ کے بجائے کراچی ہی میں اسے بھرتی کر کے ساتھ لے گیا۔

مگر ہر کھلاڑی کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکتا۔ قسمت بدلنے کے لیے فٹ بالر ایسا چاہیے جس کی ٹھوکر بزنجو جیسی ہو۔ جی ہاں، غوث بخش جیسے کھلاڑی چاہئیں تقدیریں بدلنے کو۔

5

علی گڑھ یونیورسٹی میں

تیری خوش قسمتی کہ پنہوں نے
کردیا منزل آشنا تجھ کو

(شاہ لطیف)

اب جب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ لااُبالی میں بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ' بلوچستانیت کے جذبات میں ''سرشار'' ہوکر میں بھی سرسید احمد خان کے خلاف ''بہت'' بولا ہوں............اب مجھے اس پر پشیمانی ہوتی ہے۔ بلوچستان کے خصوصی ماحول میں جہاں سرکار نے جناح، اقبال، سرسید وغیرہ کو ''بلوچ مار'' پالیسیوں کے سرکاری نظریے کے سب سے بڑے تھانیدار جتا جتا کر ہمیں مارا۔ اور ردِعمل میں اِن لوگوں کو بلوچوں سے خوب خوب گالیاں دلوائیں۔ بالخصوص نوجوانوں سے۔ بھئی 14 اگست 1947 سے لے کر 14 اگست 2016 تک کوئی تو شریف آدمی حکومت میں آتا اور محکوم قوموں اور مظلوم طبقوں سے پیار کرتا!!۔ سب جابر اور توسیع پسند۔ اور سہارا اسلام کا یا مندرجہ بالا شخصیات کا۔

حکمرانوں کو تو کبھی پچھتاوا نہیں ہوتا کہ وہ اس خصلت سے ہی محروم ہیں۔ مگر ہم جیسے عام لوگوں کو اپنے (گو کہ جائز) رویوں پر بہت تاسف ہوتا ہے۔ مجھے اور میری نسل کو سرسید احمد خان کے نظریات کے بہت سے نکات سے اختلاف رہا اور رہے گا' مگر اس کے باوجود یہ کوئی چھوٹی بات نہیں کہ اُس کے بنائے ہوئے ادارے نے غوث بخش بزنجو کو بنایا، امین کھوسہ کو بنایا۔ یوسف عزیز مگسی، پیر بخش مریدزئی (تربت)، میر فاضل خان محمد شہی، عبدالرحمٰن عالیانی وعبدالحمید عالیانی، سردار خان گشکوری، اور یوسف خان زرک زئی کو بنایا...... ارے علی گڑھ نے تو لالا غلام جان شاہوانی کو بنایا.................بلوچستان کو بنایا۔ ہم اُن کے احسان مند رہیں گے۔ مگر اردو بولنے والے ہمارے بہت سے دانش ور دوست، اور اسی طرح پنجاب کے چند ترقی پسند ادیب سرسید کو اتنا اونچا لے جاتے ہیں کہ خطے میں موجود سامراج دشمن قومی تحریکوں کا تذکرہ تک بھول جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دانستہ طور پر نسل پرستی نہیں ہوگی۔ بس اُن سے زورِ قلم میں آ کر نیک نیتی سے اس خطے میں عوامی شعور کی توہین سرزد ہو جاتی ہے۔

غوث بخش بزنجو سرسید احمد خان کے علی گڑھ میں بھی زبردست کھیلا۔ اور وہاں کی فٹ بال ٹیم کا کیپٹن بن گیا۔ وہ جب تک علی گڑھ میں رہا، ہر سال فٹ بال میں گولڈ میڈل علی گڑھ کو ہی ملتا رہا۔

فٹ بال، اُس کا اولین شوق رہا۔ علی گڑھ فٹ بال سے وابستہ رہ کر اس نے نہ صرف علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے انڈیا کی کئی جگہوں میں فرسٹ کلاس میچ کھیلے بلکہ وہ کریسنٹ فٹ بال کلب دہلی کی طرف سے بھی کھیلتا رہا۔ یہ میچ بنگال، بہار، یوپی، پنجاب، بمبئی، جے پور، بھوپال اور حتیٰ کہ دور دراز حیدر آباد، مدارس، بنگلور اور میسور میں بھی منعقد ہوئے۔ انھی مواقع نے بزنجو کو برصغیر کو، اس کے وسیع سماجی، ثقافتی، موسمی، جغرافیائی اور سیاسی رنگوں کے ساتھ، جاننے کی سعادت بخشی۔

اِس فٹ بالر نے سیاست دان بننا تھا۔ تو آیئے اسی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ایک انسان کو لیڈر بنانے کے لیے صرف ایک عنصر کافی نہیں ہوتا۔ بہت سی باتیں مل کر

ایک لیڈر، ایک ہیرو، اور ایک مصلح بناتی ہیں۔ انسان' کسی ایک شخص کی محنت یا کتابوں کی کرامت کے زور پر سیاسی ورکر نہیں بن جاتا، حقائق یہ کام کرواتے ہیں ۔ ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے ان حقیقتوں کے ادراک میں ۔ اور ماحول کا مسئلہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ بدلتا رہتا ہے، خصوصاً اس کا سماجی حصہ۔ ہمارا یہ سپورٹس مین بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے سیاسی ماحول سے متاثر ہونے لگا۔

علی گڑھ اُس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ میں تقسیم تھا ۔تقریریں ، مباحثے ، لیڈروں کی آمدورفت............ایک پُر امن سیاسی ہلچل تھی جس سے حساس بزنجو متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میر غوث بخش بزنجو مسلم لیگ میں بھرتی ہونے کی بجائے کانگریس کے خیالات کا حامی بنا۔ وہ خود اس کی دو وجوہات بتاتا ہے: ایک تو فٹ بالر کے بطور وہ دوسرے علاقوں، مذاہب، عقائد، نسلوں، اور فرقوں کے کھلاڑیوں سے مسلسل رابطے میں ہوتا، جس سے اُس کی سوچ میں وسعت آ گئی۔ دوم، اس وجہ سے کہ وہ بلوچ سماج میں پلا بڑھا تھا جس میں مذہب کی سختیوں کی بہ نسبت قبائلی اقدار اور روایتیں زیادہ بااثر تھیں۔(9) اور پھر' آہستہ آہستہ اس کا رجحان بائیں بازو کی طرف ہوا۔

میر صاحب چار سال تک وہاں رہا اور 1938 کے اوائل میں میٹرک کرنے کے بعد ایک متعین سیاسی ذہن لے کر کراچی اور پھر' بلوچستان واپس آ گیا۔ اُس کا خیال واپس جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنے کا تھا مگر بلوچستان تو اپنے بچوں کے پاؤں جکڑ دیتا ہے۔ بزنجو واپس نہ جا سکا۔

6

شادی، خاندان

میر غوث بخش بزنجو نے نال میں شادی کی۔ سردار فقیر محمد بزنجو کی ہمشیرہ بی بی جان بی بی 1945 میں اُس کی زندگی کی ساتھی بنی۔ اُس کے بطن سے چار بیٹے بیزن، سفر خان، محمد حیات اور حاصل خان، اور تین بیٹیاں بی بی ناز خاتون، بی بی خاتون ملک اور بی بی دُر بی بی پیدا ہوئیں۔

سیاست کے میدان میں بیزن نے بہت اچھی ابتدا کر دی تھی ستر کی دہائی میں۔ مگر پھر وہ جلد ہی بجھ گیا............''اتنی'' دنیاداری اُسے نہ آتی تھی۔

حاصل خان بزنجو اپنی غلطیوں سے سیکھ کر اپنے والد کی جگہ لینے کی خوب تگ و دو کر رہا ہے۔ مگر اُس کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم جیسوں سے مقابلے میں تو وہ کب کا جیت چکا ہے۔ مگر بلوچستان تو بلوچستان ہے۔ اکلوتے بیٹے جیسی فرمائشیں کرتا ہے۔ حاصل خان اُس کی ناز برداریاں کہاں کر سکتا ہے۔

محترمہ حاتون گوہر، شر آتون، اور مہتاب میر غوث بخش بابا کی بہوئیں ہیں۔(10)

7

سیاست کی بھٹی، بلوچستان

جی ہاں، بلوچستان سیاست کی فیکٹری رہا ہے۔ ماقبل تاریخ سے لے کر آج تک۔ اور اس فیکٹری میں شاید سب سے ماہر' عوامی' مقبول' اور طویل مدتی فورمین' میر غوث بخش بزنجو رہا ہے۔ اس راہ کے بانی جناب یوسف عزیز مگسی اور میر عبدالعزیز کرد رہے۔ پھر اس ہونہار بیٹے نے آ کر اپنے روحانی، نظریاتی اور سیاسی آبا کے مشن کو چار چاند لگا دیے۔

علی گڑھ سے واپسی کے وقت نیشنل پارٹی کی شہری سیاست بھی چل رہی تھی مگر اُس کے ساتھ ساتھ، بلوچستان انگریزوں کے خلاف ایک غیر مربوط مگر مستقل لڑائی میں بھی مصروف تھا۔ یہ مکمل طور پر کاغذ قلم، نقشہ، قرارداد اور جلسہ سے متعین کردہ جنگِ آزادی تو نہ تھی مگر جنگِ آزادی تو خود ایک باشعور عمل ہوتا ہے۔ لوگ شادیوں، اجتماعوں میں دور دراز اور قرب و جوار کی انگریز دشمن جنگوں کے قصے بہت جذبے سے سناتے، اور بہت توقیر سے سنتے۔

بھلا کون سی جنگِ آزادی کامیابی سے چلی ہے، جسے عام عوام کی حمایت حاصل نہ رہی ہو؟۔ چنانچہ انگریز کے خلاف بلوچوں کی آزادی کی کثیر العلاقائی جنگیں، مقبول ترین جنگیں تھیں۔

بزنجو کا اُن سے متاثر نہ ہونا' ناممکن ہے۔ اس نے انگریزی مخالفت اور آزادیِ وطن کو اپنی سیاست کے مستقل نکات بنا لیا۔

کراچی میں اُس کی ملاقات اور تعلق بلوچستان کے اُن سیاسی جلاوطنوں (میر محمد حسین عنقا اور نسیم تلوی) سے پیدا ہوا جو انگریز مظالم، ریاستی زیادتیوں اور سرداری نظام کی ہولناکیوں کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ انھی کے توسط سے وہ میر قادر بخش نظامانی سے متعارف ہوا۔

8

سیاست، سیاست، اور صرف سیاست

بزنجو نے بلوچستان واپس آکر سیاست میں ''پھنسنا'' تھا۔ (کیا مقدس کام ہے یہ!)۔

اس کا سیاست میں باقاعدہ آنا بھی بہت دلچسپ تھا، مگر ایک دفعہ جب یہ اُس سے چمٹ گئی تو پھر موت ہی ان دونوں کو جدا کر سکی۔

سیاست اور بزنجو باہم اس قدر جڑے ہوتے تھے کہ دونوں ایک ہی مظہر لگتے تھے۔ ہر پل سیاست، ہمہ وقت سیاست، ہر جگہ سیاست۔ سیاست اس کے لیے نہ فراغت کا مشغلہ تھا اور نہ دولت واقتدار کے حصول کی اسٹرٹیجی۔ وہ تو ایک فریضہ تھا۔ ریاست کے ایک شہری ہونے کے ناطے سیاست اس کے لیے ادائیگیِ فرض کا تقاضا تھی۔ لہٰذا سیاست اس کی سانس بنی، اس کا اوڑھنا بچھونا بنی۔ عطا اللہ مینگل نے ایک بار کتنا سچ کہا تھا کہ ''میں تو سیاست کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں مگر غوثی سیاست کے بغیر ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا''۔

انسانی فلاح کے مشن میں اس نے کُل بارہ سیاسی پارٹیاں یا پارٹیوں کے اتحاد بنائے۔ ایک کے بعد ایک پارٹی۔ کچھ چلیں، کچھ نہ چلیں۔ ایک پارٹی کو دوسری میں مدغم کر دیا، ایک سے

دوسری پارٹی نکال لی۔ اِس مورچے سے لڑ کر دیکھا، اُس مورچے کو آزمایا۔ مگر اِس سارے عمل میں عوام کی آبادی، آزادی ہی اس کا مرکزِ سوچ اور مقصدِ حیات رہی ہے۔ وہ اِس یک نکاتی ایجنڈے کو کبھی نہ بھولا۔

i. بلوچ لیگ

میر غوث بخش بزنجو علی گڑھ سے واپس آکر 1938 میں کراچی کی ایک سرگرم تنظیم میں شامل ہوتا ہے۔ یہ قوم دوست تنظیم کراچی کے بلوچ دانش وروں نے ''بلوچ لیگ'' کے نام سے بنا رکھی تھی۔ یہ تنظیم تقریباً اسی زمانے میں بنی، جب قلات میں انجمن بنی تھی۔ غلام محمد نور دین جو کہ بمبئی کا تعلیم یافتہ تھا، اس لیگ کا صدر تھا۔ دوسرے راہنماؤں کے نام تھے؛ مشہور تاجر واجہ عمر بخش سوبیرا، مولوی محمد عثمان، محراب خان عیسیٰ خان، مولوی عبدالصمد سر بازی، خان صاحب عثمان، پیر بخش شہداد اور اللہ بخش گبول۔ (11)

ii. قلات نیشنل پارٹی

بلوچ لیگ میں اس کی سیاست میں شمولیت کے ایک سال کے اندر اندر یعنی 1939 میں مستنگ میں قلات نیشنل پارٹی نے اپنے سالانہ کنونشن کا اہتمام کیا تھا۔ بلوچ لیگ نے بھی اس میں شرکت کی اور بزنجو کو اپنا نمائندہ بنا کر وہاں بھیج دیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں مختلف جگہوں پر مختلف ناموں کے ساتھ بلوچ سیاست ہو رہی تھی۔ یہ سب پارٹیاں ایک دوسرے سے بہت قریب ہوا کرتی تھیں۔ اُن کے ممبر آٹو میٹک طور پر ایک دوسرے کے ممبر تصور ہوتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی، بلوچ لیگ، قلات نیشنل پارٹی، بلوچستان مزدور پارٹی...........اور اس کے بعد انجمن وطن، استمان گل ....الغرض بلوچستان میں دیر تک اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ ایک سیاسی ورکر، ساری سیاسی پارٹیوں کا محترم ورکر تصور ہوتا تھا۔

نیشنل پارٹی کا اُس وقت کا صدر عبدالرحیم خواجہ خیل تھا۔مستنگ کے اس سالانہ کنونشن میں بزنجو صاحب کی شمولیت ہی دراصل اُس عالی شان عمارت کی پہلی اینٹ ثابت ہوئی، جس نے سندھ و ہند کو متاثر کرنا تھا۔ اور یہی وہ قدم تھا جو بقول بزنجو؛ ’’مستنگ میں قلات نیشنل پارٹی کا اجلاس میری تعلیم ،اورفٹ بال دونوں کے لیے آخری ضربِ کاری ثابت ہوا‘‘۔

صرف تعلیم ہی کیوں ،صرف فٹ بال ہی کیوں ؟۔ بزنجو کی تو بہت ساری چیزوں کو ضربِ کاری لگی اِس مرحلے پہ۔ بقول ملک فیض یوسف زئی؛ ’’بزنجو اِس جلسے میں آیا تو دوتین نوکر اور کپڑوں سے بھرے دوتین بکس ساتھ تھے‘‘۔

اس کروفر کو بھی آخری ضربِ کاری لگی۔ اسی فیوڈل بزنجو کو بعد میں کھدر کے دو جوڑوں اور بغل میں ایک کمبل دبائے ایک جگہ سے دوسری جگہ رواں دواں دیکھا جاتا رہا۔ساری عمر!!

صدر، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی ملک عبدالرحیم خواجہ خیل نے سالانہ اجلاس کی پہلی نشست میں تقریر کی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پارٹی کے سالانہ پُرامن اجلاس پر سرداروں کے مسلح قبائلی لشکر کے حملے کی تیاری کا علم ہو چکا تھا۔ پارٹی اس نازک مرحلے پر بہت ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتی رہی اوراس حملے کا عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند ہو کر جواب دیا۔

صدر نے نہایت مدلل انداز میں بلوچستان کو اکٹھا کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔

ذرا سی جھلکیاں دیکھیے ؛

’’دنیا کی قوموں کی یہ بڑی خواہش ہے کہ وہ ایک ہو جائیں اور ترقی کریں۔لیکن ہمیں نہ جانے کتنی جگہ تقسیم کیا گیا ہے۔ ملک تو وہی ملک تھا‘ مگر ایک حصے کو لسبیلہ‘ دوسرے کو خاران اور تیسرے حصے کو برٹش بلوچستان کہتے ہیں ۔ہم بلوچستان کے باشندے ایک قوم کے نام سے پہچانے جاتے ہیں لیکن ہمیں فرقوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے تا کہ ہمیں آسانی سے مارا اور لوٹا جا سکے اور ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔ اس طرح ہمیں کمزور کیا گیا ہے۔ ہمارے بند بند کو ایک الگ نام دیا گیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایسا دن آئے گا

کہ ہم اپنے آپ کو بلوچستانی بولتے ہوئے شرم محسوس کریں گے۔ اے جوانو! قوم کی آئندہ ترقی آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ وعدہ کرو کہ جو بھی تمھیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کرے گا، آپ ان کو شکست دینے کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہیں گے‘‘۔

اسی طرح نسل و رنگت اور زبان و پیشہ کے اوپر بلوچ عوام میں رائج سرکاری امتیاز کو بری نظروں سے دیکھا گیا:

’’ریاست قلات میں بہت سی قومیں آباد ہیں لیکن ہم حیران ہیں کہ کچھ اقوام کو سٹیٹ کونسل وشاہی جرگہ میں نشستیں فراہم کی گئیں ہیں اور دوسروں کو نہیں۔حالاں کہ ریاست کے انتظامات کا دارومدار انھی قوموں پر ہے، مثلاً سراوان کے دہوار، کچھی کے جٹ اور جاموٹ ،مکران کے بہت سے فرقوں اور ہمارے ہندوؤں کو اس حق سے محروم رکھا گیا۔ کیوں؟ وہ لوگ بھلا انسان نہیں ہیں؟۔ اول یہ کہ شاہی جرگہ وکونسل کی تشکیل غلط ہے۔ دوم یہ کہ ہم میں چھوٹے اور بڑے کا فرق پیدا کیا گیا ہے۔معلوم نہیں حکومت کا مطلب کیا ہے‘‘۔

صدر نے یہ بہت خوبصورت فقرہ بھی کہا؛

’’ریاست قلات بہت سی مصیبتوں میں گھری ہوئی ہے مگر اس قسم کے جلسوں میں ان کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے اور ان مصیبتوں کو بغیر جدوجہد کے ختم نہیں کیا جا سکتا‘‘۔(12)

وقت کے تو اپنے عزائم ہوتے ہیں۔ بزنجو کو سیاست کی دنیا میں داخل ہوتے ہی امتحان سے گزرنا تھا۔ زندگی کا اُس کا پہلا بڑا جلسہ اور اسی پر خان، انگریز اور سرداروں نے مل کر اپنے بندوق برداروں سے حملہ کروا دیا۔ وقت‘ اپنے چہرے پہ سوالیہ نشان بنائے بزنجو اور اس کے رفقا کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔ خون کا پیاسا جنگی دیوتا‘ تازہ انسانی خون چھلک چھلک جانے کا منتظر تھا۔ اس لیے کہ پوری قلات ریاست سے پارٹی کی 40 شاخوں سے آئے ہوئے ممبر جمع تھے۔اور وہ

سب مسلح تھے۔اس لیے سردار جلسہ تو نہیں روک سکے تھے، مگر جلسہ جاری رکھنے دینے میں بھی اُن کی طبقاتی پسپائی تھی۔ان کا لشکر پولیس اور لیویز تھے۔ بالآخر چھ جولائی 1939ء کی شام کو اِن سرداروں کی طرف سے نیشنل پارٹی کے پُرامن سالانہ اجلاس پر مسلح قبائلی لشکر سے حملہ کرایا گیا۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔مگر، بلوچوں کا آسمانی ذہن قیادت کرنے لپک آیا اور یہ خونیں ڈرامہ اسٹیج نہ ہو پایا۔ عدم تشدد نے تشدد کو چِت کر دیا۔ پولیس اور لیویز آئی۔ جلسے کا دوسرا سیشن ہی منسوخ کر دیا۔ سازشیوں کو ازلی شرمندگی مل گئی، اس لیے کہ بہت بڑی خون ریزی نہ ہوئی۔

سرداروں نے جھٹ سے ایک تیار شدہ درخواست پر خان سے دستخط کروالیے، جس میں مطالبہ تھا کہ؛ ملک عبدالرحیم خواجہ خیل صدر قلات نیشنل پارٹی، رئیس ملاّ حسین آبی زئی، ارباب شاہنواز خان اور میاں نورالحق کو گرفتار کیا جائے۔نیشنل پارٹی کے ارکان میر محمد فاضل خان محمد شہی وزیر تعلیم اور مرزا فیض اللہ خان انسپکٹر مدارس کو نوکری سے نکالا جائے۔مولانا محمد عمر اور مولانا عرض محمد کو ریاست بدر کیا جائے۔دارالعلوم مستونگ کو بند کیا جائے، تمام بلوچستانی اخبارات کا داخلہ ریاست قلات میں بند کیا جائے۔اور، قلات نیشنل پارٹی کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔(13)

............بات من وعن قبولیت پا گئی۔

چنانچہ، ناکام فریق یعنی سرکار اور سرداروں نے، کھمبا نوچتے ہوئے پارٹی کو غیر قانونی قرار دلوایا۔(بلوچوں کے حکمران، یعنی خان قلات میر احمد یار خان نے جس پارٹی پر پابندی لگائی تھی، اسی پارٹی نے پھر یحیٰی خان اور بھٹو کے ہاتھوں ایسی ہی پابندی جھیلنی تھیں!!)۔پارٹی کے جو رہنما مستنگ پہنچ پائے تھے، انھیں گرفتار کر کے قلات بدر کر دیا گیا۔سرداروں نے پارٹی ورکروں کے گھروں کو سنگسار کیا، ان کے باغوں کے درختوں کو کاٹ ڈالا، نہالوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا، اُن کے آلووں کے کھیتوں کو غارت کیا۔مستنگ کی گلیاں اور بازار عراق کا کربلا بنا دیے گئے، خان کی سرکار اور انگریز کا پولیٹیکل ایجنٹ نظارہ کرتے رہ گئے۔ بزنجو صاحب قلات گیا اور خان قلات سے اس سارے عمل پہ احتجاج کیا۔اس نے خان سے بہت باتیں کیں، مگر اسے اندازہ ہوا کہ خان کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔تماشا تو یہ ہوا کہ خان نے اسے وہیں اپنے مہمان خانہ میں نظر بند کر دیا۔(14)

ایک ہفتے کے اندر خان قلات نے بزنجو کی جائیداد کورٹ آف وارڈ سے واگزار کردی اور اس کی جائیداد کی آمدنی سے ماہوار جو وظیفہ ملتا تھا، بند کر دیا تاکہ بزنجو اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ خان قلات کے اس بے دردانہ فیصلے نے بزنجو کو اُس آمدن سے محروم کر دیا جس سے وہ اپنی تعلیم جاری رکھ پاتا۔اُس کا کوئی زندہ بڑا یا چھوٹا بھائی نہ تھا، جو زمین سنبھال لیتا۔ بے بس نوجوان تعلیم ختم کرکے اپنے ذرائع معاش کی دیکھ بحال کرنے پر مجبور ہوا۔ بزنجو مایوسیوں اور دل شکنی کے انبار کو سینے سے لگائے، مگر ایک نئے عزم کے ساتھ نال، جھاؤ، کولواہ اور مکران کو روانہ ہوا۔(15)

رہا ہونے پر میر صاحب نے وہ کام شروع کیا جس کی ڈیوٹی ساتھیوں نے لگائی تھی یعنی پارٹی کے دوست جہاں جہاں ہیں اور نوکریاں کر رہے ہیں، وہ اس سے جا کر ملے اور انھیں نوکری چھوڑنے پر آمادہ کرے۔خانِ قلات سے ناراضگی کے اظہار کا یہ بھی ایک مؤثر طریقہ تھا۔اس لیے کہ اس کی خانی انھی تعلیم یافتہ لوگوں پہ چل رہی تھی جو اس روشن خیال پارٹی میں شامل تھے۔ چنانچہ میر غوث بخش بزنجو تربت گیا۔میر عبدالعزیز خان سے ملا جو مکران میں نائب وزیر تھا۔میر گل خان جیونی میں تھا، میر بہرام خان............مگر اسی دوران اسے مکران بدر کر دیا گیا۔اور مکران بدر بزنجو جلاوطن ہو کر کوئٹہ پہنچا۔

بابا غوث بخش، میر عبدالعزیز کرد، میر گل خان نصیر، فیض محمد یوسف زئی کی بنائی ہوئی قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی میں اپنے ساتھیوں کامریڈوں کے ساتھ کرتا پڑتا، یہاں وہاں دوڑتا بھاگتا بالآخر دشمن کے خلاف، جھاڑیوں پتوں والی معمولی سی آگ جلانے میں کامیاب ہوگیا۔میر نے اپنی پوری قوت صرف کی کہ بلوچستان ایک آزاد، اور خودمختار وطن کے بطور دنیا کی دیگر قوموں کی قطار میں کھڑا ہو جائے۔اُس کی رفاقت میں قلات نیشنل پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں نے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، ہر خیمے میں صدا لگائی اور ہر فرد کو ساتھ ملایا۔جدوجہد کی۔مگر سردار نواب اپنی چالاکی اور روسیاہ حرکتوں سے باز نہ آئے۔اور بہت کامیابی کے ساتھ پارٹی ورکروں کی ساری بھاگ دوڑ اور محنت کو پاؤں تلے روندتے ہوئے پارٹی پر پابندی لگوا چکے اور 1940ء کے اوائل میں بزنجو کو قلات بدر کرا دیا گیا............ہم آپ لاکھ اس بہکاوے میں رہیں کہ صرف پاکستانی حکومتیں آمرانہ رہی ہیں

یا آمریت صرف مارشل لا میں ہے.....مگر، بزنجو کو تو پاکستان بننے سے دس سال قبل بھی جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اپنے بلوچ بھائی، اپنے ہی خان قلات کے ہاتھوں، اور اپنی ہی بلوچ ریاست سے۔ اس طرح وہ اپنے دوسرے جلا وطن ساتھیوں سے جاملا اور ریاست قلات کی حدود سے باہر سارے ہندوستان میں ریاستی نظام کے خلاف بولتا رہا اور ہر سیاسی پارٹی کے پاس گیا۔ مگر سوائے کانگریس کے لیڈروں کے کسی نے اس کی ہمت افزائی نہ کی۔ وہ 1939ء اور 1942ء میں قلات ریاست سے جلاوطن رہا۔ کہیں جا کر دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کی ریاست بدری کے احکامات واپس لیے گئے اور تب کہیں جا کر نیشنل پارٹی پھر سے کام کرنے کے قابل ہوگئی۔

(iii). آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانفرنس

برٹش انڈیا میں عوام، انگریز سامراج سے مکمل آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اور اُن کی آزادی کی تحریک نے ریاستوں کے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی اور ریاستوں سے آزادی پسند نوجوانوں نے ملک کی آزادی کی تحریک کا حصہ بننے کے لیے ریاستوں کے عوام کی تنظیم کی۔ یہ دراصل شہزادوں والی ریاستوں کے اندر کانگریس کی دوسری شکل تھی۔

یہ تنظیم 1936 میں سٹیٹ پیپلز کانفرنس کے نام سے قائم کی گئی۔ اس تنظیم کا صدر شیخ محمد عبداللہ بنا۔ جواہر لال نہرو اس کا نائب صدر تھا۔ بزنجو کے احباب کی سیاست کے زمانے میں آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانفرنس کا صدر یہی جواہر لال نہرو تھا۔ 1941ء میں میر غوث بخش بزنجو نے قلات نیشنل پارٹی کو آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس میں شامل کر دیا۔ میر بزنجو ریاستِ قلات کے عوام کی طرف سے اس تنظیم کی مرکزی کمیٹی کا رکن بنا۔ اس طرح گاؤں شانک سے نال تک اور وہاں سے کوئٹہ تک، اور پھر وہاں سے کراچی تک، اور پھر وہاں سے علی گڑھ تک یہ بلوچستانی غوث بخش اب وسیع تر ہندوستانی سیاست سے مضبوط بنیادوں سے جڑ گیا۔ اور اسے اُس زمانے کے مشہور اور چوٹی کے سیاست دانوں جواہر لال نہرو، شیخ محمد عبداللہ، مولانا ابوالکلام آزاد، بخشی غلام محمد، سیف الدین کچلو اور دیگر کئی نامور لیڈروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ مگر بلوچستان کی طرف سے،

ریاست قلات کی طرف سے، بلوچ عوام کی طرف سے............ وہ ہر جگہ بلوچستان کی آزادی کی بات کرتا جاتا اور منواتا جاتا۔

اِس بڑے دھارے میں بلوچ پارٹی کو شامل کر کے بہت کچھ حاصل کیا گیا، ہندوستانی عمومی تحریکِ آزادی کے لیے بھی اور خود بلوچستان کے لیے بھی۔

مثلاً اگست 1945ء کو سری نگر کشمیر میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی زیر صدارت تمام ہندوستان کی ریاستوں کی انجمن کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، جس میں ذیل کی قرارداد پاس کی گئی؛

> آل انڈیا سٹیٹ پیپلز کانفرنس کمیٹی کو معلوم ہوا کہ ریاست قلات کی حکومت نے قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی ریاست میں جدوجہد پر پابندی لگا کر پریشان کن پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔
>
> ملک عبدالرحیم خان صدر (قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی) اور دوسرے سرکردہ کارکنوں کو ریاست کی حدود کے باہر رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور بلوچستان سے بعض قومی اخبارات کے داخلے کو ریاست قلات میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔
>
> یہ کمیٹی اس پالیسی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور خان قلات سے مطالبہ کرتی ہے کہ موجودہ حالات اور ہندوستان اور دنیا میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کے پیشِ نظر وہ (خان قلات) اس طرح کی تمام پابندیوں کو دور کر کے شہری آزادی اور نیشنل پارٹی کا پر امن جائزہ لے۔

''جب انگریز جانے لگے تو اس سے پہلے نیشنل پارٹی نے میٹنگ کی اور ہم نے وائسرائے کو، جناح صاحب کو، گاندھی کو، مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو کو ٹیلی گرام روانہ کیے کہ بلوچستان، ہندوستان کا کبھی بھی حصہ نہیں رہا ہے۔ اور نہ ہی ہے......آپ مہربانی کر کے ہمیں اپنے پاکستان اور ہندوستان کے مسئلے میں نہ گھسیٹیں...... میں خود مولانا آزاد سے ملا کیوں کہ اس وقت مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ میں ان سے ملا اور کہا صورت حال یہ ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہو

رہا ہے کہ آپ اپنے ہندوستانی قافلے کے ساتھ ہمیں بھی لے رہے ہیں تو ہم بے گناہ لوگ ہیں ۔ ہمیں آپ کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟۔ہم ایرانی پلیٹو کے لوگ ہیں، برصغیر کا کبھی حصہ نہیں رہے ۔ آپ براہ مہربانی اس مسئلے پر ہماری مدد کریں......

مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ تو درست ہے اور ہم آپ کے مؤقف سے پوری طرح متفق ہیں ۔مگر اس میں ہماری بھی مجبوریاں ہیں ۔ ہندوستان کے 40 کروڑ انسانوں کی آزادی کو بلوچستان کے لیے مسخ نہیں کیا جا سکتا ۔ کیوں کہ اگر آپ آزاد ہوتے ہیں تو آپ اتنے کمزور ہیں کہ آپ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوسکتے ۔کسی باہر کی طاقت سے ہاتھ ملائیں گے، انگریزوں کو یہاں لا بٹھائیں گے ۔جس کی وجہ سے ہندوستان کی آزادی پر اثر پڑے گا۔اس کے لیے ہم تیار نہیں ہیں ۔(16)

اسی دوران 1943 میں بزنجو صاحب '' شانک جھاؤ'' سے اپنے آبائی گاؤں '' نال'' میں منتقل ہوگیا۔

iv . کمیونسٹ پارٹی

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بزنجو نے جب بلوچستان آ کر سیاست شروع کی تو ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے شروع کی ۔ یہاں ایک کمیونسٹ پارٹی موجود تھی اور کام کر رہی تھی ۔قادر بخش نظامانی تو، بزنجو کے کمیونسٹ بننے سے تین برس قبل 1934ء میں کمیونزم کی کشش کے ہاتھوں ماسکو ڈیڑھ برس کے لیے گیا اور واپس آ کر وہ امین کھوسہ اور عنقا صاحب کے ساتھ 1937ء میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی بنا چکا تھا۔ بزنجو 1937ء میں ہی ہندوستان میں کمیونسٹ بن کر آیا اور یہاں بنی ہوئی پارٹی کا ساتھی گیا۔

جیسے ہم بتا چکے ہیں کہ بزنجو صاحب 1937ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہوا تھا۔(17) وہ اس پارٹی کے ساتھ لگتا ہے بہت دیر تک جڑا رہا۔ اِس اچھے ڈسپلن میں رہ کر عوامی تنظیمیں یا پارٹیاں بناتا رہا،اُن میں کام کرتا رہا۔حتمی طور پر وہ 1950ء تک اس پارٹی میں رہا ہوگا۔

بعد میں تو بس............

v . بلوچستان مزدور پارٹی

یہ بہت دلچسپ زمانہ تھا۔سماج، تنظیم کے لیے بے چین لگتا تھا اور تنظیمیں، بزنجو صاحب کو ساتھ لینے کے لیے مچل رہی تھیں ۔اِن میں سے ایک تنظیم ''بلوچستان مزدور پارٹی'' بھی تھی ۔ بلاشبہ میر صاحب اس میں شامل ہی نہ تھا بلکہ وہ تو اس کے لیڈروں میں سے ایک تھا۔

ہمیں اس پارٹی کے متعلق بہت کم معلومات ہیں ۔میسر دستاویزات بتاتی ہیں کہ 1941ء میں یہ پارٹی بنی تھی ۔ 1942ء میں یوم مئی کے موقع پر کوئٹہ میں میکموہن پارک میں اس پارٹی نے ایک جلسۂ عام کیا۔ پارٹی نے وہی مشہور لائن اپنالی جو سندھ بلوچستان کمیونسٹ پارٹی نے دنیا بھر میں سب سے پہلے اپنائی تھی، یعنی عالمی جنگ کی حمایت کرنا اس لیے کہ ہٹلر نے سوویت روس پر حملہ کیا تھا۔اس کے علاوہ پارٹی جلسے نے بلوچستان کے محنت کشوں کے حالات کی بہتری کے حق میں قراردادیں منظور کیں ۔ایک ہزار سے زائد کے اجتماع میں ملک سید محمد شفیع اسدی، پارٹی سیکرٹری عبدالکریم امن، محمد حسین عنقا، شمیم، سردار جیت سنگھ، اور محمد حسن نظامی نے تقریریں کیں ۔ہمیں یہاں اس جلسے سے متعلق دستیاب دستاویز کا صرف یہ پیراگراف چاہیے تھا:

''اس کے بعد میر غوث بخش بزنجو نے پارٹی کی بنیادی پالیسی کا ریزولیشن پیش کیا۔ بزنجو اس ریزولیشن پر آدھ گھنٹہ برابر بولتے رہے۔ آپ کی تقریر سے تمام پبلک میں جوش پھیل گیا۔ مزدوروں نے بار ہا تالیوں اور نعروں سے آپ کی تقریر کو سراہا۔تقریر ریزولیشن کی وضاحت اور ضرورت کو اتنی روشن کر گئی کہ پبلک نے جوش سے ریزولیشن منظور کی ۔ ریزولیشن کی تائید محمد حسین عنقا نے کی اور مزید وضاحت وضرورت مثالوں اور نظموں کے ساتھ کی''۔(18)

اور جب سبی میں ریلوے مزدوروں نے ہڑتال کی تھی تو حکومت کے ساتھ مذاکرات میں مزدوروں کا نمائندہ بزنجو ہی تھا۔

****

مگر لگتا ہے کہ ساری بڑی سرگرمیاں قلات نیشنل پارٹی کے حوالے سے ہوتی رہیں۔ بزنجو صاحب کی اس پارٹی نے ریاست قلات میں ایک منتخب حکومت کے مطالبے کو ہمیشہ اولیت دی۔ ہمیں اکتوبر 1945ء کے اس پارٹی کی قراردادوں کا مسودہ ملا تھا جو ہم نے ماہنامہ 'نوکیس دور' کے مارچ اپریل 1992ء کے ایڈیشن میں شائع کیا تھا۔ میں وہاں سے اپنے موضوع سے مطابقت والی قرارداد/ قراردادیں یہاں نقل کرتا ہوں:

''قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی جنرل باڈی کا یہ اجلاس پارٹی کے ورکنگ کمیٹی کی سابقہ قرارداد متعلقہ قلات سٹیٹ کونسل جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ جب تک ریاست قلات میں نمائندہ حکومت (جو عوام کے سامنے جواب دہ ہو) قائم نہ کی جائے، ریاست قلات کی ترقی و بہبودی ناممکن ہے، کی تصدیق کرتے ہوئے حکومت ِقلات سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ عوام کے فلاح و بہبود اور ریاست قلات کی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے جلد از جلد ریاست قلات میں نمائندہ حکومت قائم کرے۔

محرک: میر غوث بخش بزنجو

مؤید: میر گل خان ذگر مینگل

تائید مزید: میر محمد فاضل خان محمد شئی''

اسی اجلاس میں میر غوث بخش بزنجو نے ایک قرارداد پیش کی تھی:

''قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کی جنرل باڈی کا یہ اجلاس حکومت قلات کی توجہ مکران کی خستہ حالت کی طرف مبذول کراتے ہوئے اظہار کرتا ہے کہ علاقہ مکران میں غلہ کی سخت قلت ہے۔ حکومت نے جو قلیل امداد کی ہے، وہ بالکل ناکافی ثابت ہوئی ہے۔ باشندگانِ مکران کی خراب حالت میں اس امداد سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ آئے دن غلہ کی شکایات بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ اجلاس حکومتِ قلات سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ علاقہ جھالاوان سے جو مکران کے قریب ہے، مکران میں غلہ کے نکاس کی عام اجازت دی جائے اور جھالاوان سے دوسرے علاقوں میں غلہ

نکاس کرنے پر اس وقت تک کڑی پابندی عائد ہو جب تک کہ مکران میں غلہ کی شکایت بالکل رفع نہ ہو۔ نیز مکران اور جھالاوان کے تجارت پیشہ افراد کو اس سلسلہ میں سہولیات بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ مکران میں با آسانی غلہ پہنچا سکیں۔ نیز مکران میں اشیائے خورد و نوش اور کپڑا پہنچانے کا خاطر خواہ انتظام ہو۔ ملازم اور غیر ملازم منافع باندی اور قاچاقوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

محرک: میر غوث بخش بزنجو

مؤید: سید مدد علی شاہ بھاگ ناڑی''

9

آزاد بلوچستان

ایک گول میز کانفرنس جیسی میٹنگ دہلی میں چار اگست 1947ء کو منعقد ہوئی، جس کی صدارت وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کی۔ جس میں اُس کا قانونی مشیر لارڈ اِس میں بھی شامل تھا۔ بلوچستان (ریاست قلات) کی طرف سے خان احمد یار خان، وزیر اعظم بیرسٹر سلطان احمد، اور پاکستان کی نمائندگی محمد علی جناح اور لیاقت علی خان نے کی۔

اس میں تین نکاتی سمجھوتے پر دستخط کیے گئے:

1- حکومتِ پاکستان، ریاست قلات کی آزاد حیثیت تسلیم کرتی ہے، جس کے برطانوی حکومت کے ساتھ معاہداتی تعلقات موجود ہیں اور جس کی پوزیشن اور مقام ہندوستان کے دیگر شہزادوی ریاستوں سے مختلف ہے۔

2- یہ فیصلہ کرنے کے لیے قانونی رائے لی جائے گی کہ آیا پاکستان اُن معاہدوں اور لیز پہ لیے ہوئے علاقوں کا جاں نشین ہوسکتا ہے۔

3- قانونی مشورے لینے کے بعد پاکستان اور قلات کے نمائندوں کے بیچ مزید

مذاکرات ہوں گے۔ عبوری دور میں برطانوی حکومت کو لیز کردہ علاقوں سے متعلق پاکستان اور قلات کے درمیان ایک standstill (جاریہ) معاہدہ ہوگا۔

اس معاہدے کے بعد گیارہ اگست 1947 کو حکومتِ قلات اور مستقبل کی پاکستان حکومت کے درمیان دہلی میں ایک اور معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی پہلی ہی شق میں، (جسے حکومت پاکستان کی طرف سے آل انڈیا ریڈیو پر باقاعدہ نشر کیا گیا) کہا گیا؛ ''حکومت پاکستان رضامند ہے کہ قلات ایک آزاد مملکت ہے..........''۔

دہلی سے واپسی پر خان قلات نے بارہ اگست 1947ء کو جمعہ کے دن (پاکستان کی آزادی سے دو دن قبل) بلوچستان کی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ اسی روز جامع مسجد قلات میں خان کے نام کا اسلامی خطبہ پڑھا گیا اور مسجد کے صحن ہی میں بعد از نمازِ جمعہ آزاد قلات کا جھنڈا لہرایا گیا۔

9.1

بلوچستان کا قومی پرچم

دنیا کی تاریخ میں جھنڈا ابھی دلچسپ نشان رہا ہے۔ بہت پرانے زمانے میں لوگ مختلف دیوی دیوتاؤں کے ٹھکانوں پر پہچان یا پتے کے لیے نشان بنا دیتے تھے اور اس نشان کو دروازے کے اوپر یا مکان کی چوٹی پر بناتے تھے، تاکہ زیارت کرنے والا دور سے دیکھ کر اپنے دیوتا کے مندر میں چلا جائے۔

کافی زمانہ گزرنے کے بعد عبادت گاہوں کے متولیوں نے ان نشانوں کو اپنے اپنے گھروں پر لگانا شروع کیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ ان کے خاندانی نشان بن گئے۔ شروع میں ہر نشان اپنی قدرتی یا اصلی حالت میں کسی ڈنڈے میں باندھ دیا جاتا تھا۔ مثلاً کسی کا نشان تلوار تھا، کسی کا کھجور کی شاخ، کسی کی علامت جھاڑو تھی، کسی کی گھاس۔ ایران میں جب کاوہ لوہار نے ضحاک کے ظلم کے خلاف بغاوت کی تھی تو باغیوں نے کاوہ کے کارخانے کی دھونکنی کے چمڑے کو اپنا نشان بنالیا تھا۔ اور

جدھر وہ نشان کاویانی جو درفش کاویانی کے نام سے معروف ہوا لہراتا تھا اُدھر باغی پہنچ جاتے تھے اور اپنی جانیں اس کے نشان کے لیے نہیں، اس نشان کے مقصد کے لیے لڑا دیتے تھے۔ یہ مقصد ظلم سے آزادی اور عزت کی زندگی کے حصول کا تھا۔

پوجا اور بندگی کرنے والوں نے جب جنگ کے میدان میں قدم رکھا تو ہر قبیلے یا فوجی دستے کا ایک پرچم بن گیا اور چمڑے کی جگہ سوتی یا ریشمی کپڑے پر ان کی علامتیں تصویروں کی شکل میں بننے لگیں۔ رستم نے سیمرغ کو اپنا خاندانی نشان بنایا۔ اسی طرح بہت سے قبیلوں اور بادشاہوں نے اپنی ہیبت کا اظہار کرنے کے لیے شیر، عقاب، گدھ اور گینڈے کو پرچم پر لہرایا۔ موجودہ دنیا میں ترکی کا جھنڈا ہلال اور جاپان کا سورج، انگلستان کا نشان شیروں والا اور جرمنی کا نشان عقاب ہے۔ کینیڈا نے گیہوں کی بالیوں، سوویت یونین نے درانتی ہتھوڑے اور ہندوستان نے چرخے سے اپنی سوسائٹی کی حالت کو نمایاں کیا اور سب کی یہ کوشش ہے کہ جنگ ہو یا امن، انکا نشان' یا جھنڈا ہمیشہ لہراتا رہے۔

قلات ریاست کا جھنڈا سرخ و سبز رنگ کا مستطیل تھا۔ جس میں سبز اوپر اور سرخ نیچے کے حصے میں تھا اور درمیان میں چاند تارے کا نشان تھا۔ آزاد قلات کے جھنڈے میں رنگ تو وہی سرخ و سبز رہنے دیے گئے لیکن جھنڈے کی بناوٹ تکونی کردی گئی اور یہیں چاند تارے پر کلمہ طیبہ کا بھی اضافہ کردیا گیا۔

9.2

بلوچستان کا آئین

ریاست قلات کے اعلانِ آزادی کے بعد خان نے ریاست کے لیے ایک تحریری آئین ''فرمان'' کے ذریعے نافذ کیا۔ اس کے تحت ایک وزیراعظم اور کابینہ بننا تھا، جسے خان نے مقرر کرنا تھا۔ وزیر اور وزیراعظم بننے کے لیے بلوچ ہونا ضروری نہ تھا، حتیٰ کہ بلوچستانی ہونا، بلکہ ایشیائی ہونا بھی ضروری نہ تھا۔ چنانچہ خان نے نوابزادہ محمد اسلم کو وزیراعظم مقرر کیا۔ ہم جیسے کم پڑھے

لکھے لوگ دیر تک لفظ ''نواب زادہ'' سے دھوکا کھاتے رہے کہ یہ کوئی بلوچ ہوگا۔ نہیں، وہ بلوچ نہ تھا۔ وہ گوشت پوست میں بھی، اور وفا و کام میں بھی، قلات ریاست سے دُور، پاکستان سے لیا گیا تھا۔ اسی طرح ریاستِ قلات کا وزیر خارجہ ڈی، وائی فَیل' ایک انگریز تھا۔

اس ایکٹ کے مطابق ریاست میں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کے نام سے دو ایوانوں کی صورت میں پارلیمنٹ ہونی تھی۔ جس کا دورانیہ پانچ برس رکھا گیا۔ مگر خان اگر ضروری سمجھتا تو اُسے پہلے بھی برطرف کر کے چھ ماہ کے اندر اندر نئے الیکشن کروا سکتا تھا۔ یا اگر چاہتا تو ایک سال تک اُسے توسیع دے سکتا تھا۔ دیوانِ عام 52 ممبروں پر مشتمل تھا، جس کی تفصیل یوں ہے:

ساراوان سے چھ ممبر، جھالاوان سے چھ، کچھی سے چھ، مکران سے دس، تحصیل قلات سے تین، علما پانچ، ہندو تاجر پانچ، مسلم تاجر پانچ، ہندو ایک، نامزد پانچ.......... واضح رہے کہ ان کل 52 نشستوں سے 47 نشستیں صرف مالیہ دِہ علاقہ کے لیے مخصوص تھیں۔

دیوانِ خاص کی تمام 36 نشستیں صرف جرگہ ممبر (سرداروں) کے لیے مخصوص تھیں۔

دیوانِ عام کے ممبر بھی عام غریب غربا نہ تھے بلکہ امیر لوگ ہی اِن الیکشنوں میں حصہ لے سکتے تھے۔ یعنی اِن ممبروں کا انتخاب صرف مالیہ دِہ علاقوں کے معتبرین کے ووٹوں سے ہوتا تھا۔ معتبر کی تعریف یوں کی گئی: ''کسی علاقہ یا گاؤں کے سرکردہ آدمی، جنھیں بعض قبائل ارباب، نمبردار، ٹکری، کاوُدہ یا مقدم بھی کہتے ہیں''۔

اس ایکٹ کے مطابق ''ہر وہ 21 سالہ، صحیح العقل شخص اِس دیوان کی ممبری کے لیے الیکشن لڑ سکتا تھا جو ریاست کا مستقل باشندہ ہو، گذشتہ دس سال میں ریاست کے خلاف کسی جرم یا اخلاقی جرم کا سزا یافتہ نہ ہو۔ سو روپے سالانہ سے کم مالیہ نہ دیتا ہو' یا جس کی غیر منقولہ جائیداد چار ہزار روپے (اُس زمانے کے) سے کم مالیت کی نہ ہو''۔ ماسوائے مولویوں کے۔

بھئی یہ بھی غنیمت تھی۔ ایک لاپرواہ، غیر جواب دِہ شخصی حکمرانی میں جائیداد والوں کا ہی سہی، ایک پارلیمنٹ کا تصور ہی انقلاب جیسا تھا۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ یہ پارلیمنٹ کوئی اختیار وغیرہ رکھتی تھی۔ ایوان صرف تجاویز دے سکتا تھا۔ وزرا اس کے سامنے جواب دہ نہ تھے۔ ہر ممبر، ہر اجلاس

کے دوران دس تک سوال پوچھ سکتا تھا۔ بجٹ پر صرف بحث اور اعتراض کیا جا سکتا تھا۔ خان کی مرضی تھی کہ وہ جس شعبہ کو چاہتا، خصوصی قرار دیتا اور جس پر بحث نہیں ہو سکتی تھی۔ اجلاس سال میں کم از کم ایک بار ضروری تھا۔ البتہ ایک تہائی ممبروں کے لکھ کر دینے سے وزیر اعظم اجلاس بلواتا تھا، بشرطیکہ خان منظوری دے۔

دیوانِ عام کی مدت تو پانچ سال تھی مگر ظاہر ہے دیوانِ خاص غیر معین مدت تک کے لیے تھا۔ اس لیے کہ سردار کب مرتا ہے، اُس کا بیٹا، پھر اُس کے بیٹے کا بیٹا............ موروثی ممبری ہوتی تھی یہ۔

چنانچہ بلوچستان کی تاریخ میں پہلی بار مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق انتخابات ہوئے۔

میر بزنجو نے دسمبر 1947ء کو قلات اسمبلی کے دیوانِ عام کے انتخابات میں خضدار نال حلقے سے حصہ لیا اور 52 کے ایوان میں 39 ممبران کی اکثریت لے کر ایوان میں آن موجود ہوا۔ دیوانِ عام میں اس کی پارٹی سب سے بڑی پارٹی بنی، مگر چوں کہ اُس کی قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی پر پابندی تھی اس لیے پارٹی ممبروں نے الیکشن میں انفرادی طور پر حصہ لیا تھا۔ 12 دسمبر 1947ء کو شاہی کیمپ ڈھاڈر میں منعقد ہونے والے دیوانِ عام کے اجلاس میں بزنجو صاحب دارالعوام کا پارلیمانی لیڈر منتخب ہو گیا۔

گیارہ اگست کو انگریزوں کی جانب سے آل انڈیا ریڈیو سے ریاست قلات کی ''آزادی'' کا اعلان ہوا۔ 14 اگست کو پاکستان نے 27 رمضان، اور 15 اگست کو ہندوستان نے ''شُبھ گھڑی'' کے حوالے سے اپنی اپنی آزادیوں کے دن متعین کیے۔ (اسی دن سے پورا برصغیر استخاروں، ڈنڈا پیروں، بُرے اچھے خوابوں اور پنڈتوں کی ''شبھ گھڑیوں'' کے حوالے ہے)۔

10

بلوچ پارلیمنٹ میں

سب سے بڑی بحث

آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ غلام رہنا اور غلام رکھنا دونوں بدقسمتیاں ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں آزاد بلوچستان اور نومولود پاکستان دونوں بدقسمت نکلے، اس لیے کہ نومولود پاکستان نے جنم لیتے ہی قلات کی آزاد ریاست کو اپنے اندر ہڑپ کرنے کا حرص باندھ لیا۔ اس ناجائز کام کے لیے اس نے ہر جائز طریقہ استعمال کیا۔ اس نے سب سے پہلے خان پہ ذاتی طور پر ڈورے ڈالے۔ اس کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی؛ لالچ، پیسہ، عہدہ، پیش کشیں کیں۔ پھر خوف، دھمکی سے کام لیا اور ہر طرف سے ناکام ہو کر پھر عیاری، بے قولی اور سازش کے روباہی حربے استعمال ہوئے۔ اس نے خاران، مکران اور لسبیلہ باقاعدہ سازش کے ذریعے بلوچستان کی ریاست سے کاٹ دیے۔ اور بقیہ ٹکڑے کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے بے انتہا دباؤ جاری رکھا۔ اُس روز پاکستان کو ایسی بددعا لگی کہ پھر نہ مشرقی پاکستان ٹھہرا اور نہ بقیہ صوبوں سے اسے چین ملا۔

اب، بلوچ پارلیمنٹ کو زندگی اور موت کے مسئلے کا سامنا تھا۔ بہت ہی سائنسی اور بہت

ہی جمہوری انداز میں کامیابی کے ساتھ پارلیمنٹ نے بحث کے بعد ایک متفقہ مؤقف اختیار کیا............ بزنجو جو وہاں تھا!!

بارہ دسمبر 1947ء میں دیوانِ عام کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ یہ بلوچ تاریخ کی اولین پارلیمنٹ کا اولین اجلاس تھا۔ ممبروں کو ’عالی جاہ‘ کہا جاتا تھا۔ ممبروں نے خان اور آزاد قلات کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد خان نے تقریر کی۔

دو دن بعد یعنی 14 دسمبر 1947ء کو ڈھاڈر میں دیوانِ عام کا اجلاس ہوا۔ اِس میں ایوان نے بلوچی زبان کو بلوچستان کی قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا۔ اور بلوچی کو ذریعہِ تعلیم بنانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔

ایک بہت ہی اہمیت والی بات بھی چھڑی تھی۔ ریزولیشن نمبر 25 عالی جاہ میر غوث بخش بزنجو نے پیش کی تھی: ’’میں تجویز کرتا ہوں کہ اقوام کورک، کوراہی اور سونگر سکونہ تحصیل کولواہ پر جو ٹیکس عائد ہے اس کو ہٹایا جائے‘‘۔

میر غوث بخش خان نے وضاحت کی کہ ’’اقوام کورک، کلیرزئی، کولواہی اور سونگر وغیرہ تحصیل کولواہ میں آباد ہیں۔ مقامی اصطلاح میں یہ ’خان براث‘ مشہور ہیں۔ عموماً یہ لوگ کاشت کار ہوتے ہیں۔ کولواہ میں جہاں کہیں وہ کسی ’زمیندار‘ کے پاس بطور بزگر کام کرتے ہیں تو وقتِ برداشتِ فصل زمیندار سے اُن کو بزگری کا جو حصہ ملتا، حکومتِ قلات ان سے اس حصہِ بزگری پر ساتواں حصہ بطور ٹیکس وصول کرتی ہے۔ چوں کہ ان اقوام کے حقِ مزدوری پر حکومت کی طرف سے دائمی ٹیکس مقرر ہے، اس لیے کوئی ان کو بزگر بنانا پسند نہیں کرتا۔ کیوں کہ ان کے بزگر ہونے کی صورت میں زمیندار کی تمام زیرِ کاشت فصل حکومت کی نگرانی میں چلی جاتی ہے۔ اس امتیازی سلوک کی بنا پر اُن کو کہیں بزگری نہیں ملتی۔ سماجی طور پر اُن کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ مساوات اور آزادی کے اس دور میں قلات کی اسلامی اور بلوچی حکومت کا اپنی ہم مذہب اور ہم نسل رعایا کے ساتھ اس قسم کا غیر منصفانہ سلوک روا رکھنا حکومتِ بلوچی کے نام پر بدنما داغ ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ اس ٹیکس کو فوراً منسوخ کیا جائے‘‘۔

اجلاس میں پاکستان کے ساتھ ریاست قلات کے الحاق پر بحث ہوئی۔ جس کی بزنجو نے بہت مخالفت کی اور ایک طویل، مدلل اور جامع تقریر کی۔ یہ تقریر بلوچستان کی تاریخ کی اہم ترین دستاویز ہے۔ مدلل انداز اور جامع بیانی بزنجو کی زندگی کی اچھی عادتوں میں سے خوب صورت ترین عادت بنی۔ تفصیل سے، مکمل پس منظر بیان کرتے ہوئے، پورے سیاق و سباق کے ساتھ بلوچستان اسمبلی (دارالعوام) سے خطاب کرتے ہوئے بزنجو نے کہا تھا:

’’پاکستان سے الحاق کا مسئلہ اگرچہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے بہت نازک ہے لیکن یہ ہماری پریشانیوں میں اضافہ کا باعث نہیں بن سکتا۔ اس لیے اس دیوان کے عالی جاہ ممبر اس امر سے کبھی غافل نہیں رہے ہیں کہ ہم نے اگر آزاد رہنا ہے تو ہم اپنی آزادی کو کس طرح بچا سکتے ہیں۔ افغانستان اور ایران کی طرح ہماری ثقافت مختلف ہے۔ ہم مسلمان ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم اپنی آزادی کھو کر دوسروں میں جذب ہو جائیں۔ اگر محض ایک مسلمان حکومت ہونے کی حیثیت سے قلات کا پاکستان میں شامل ہونا ضروری ہے تو پھر افغانستان اور ایران کی اسلامی حکومتوں کو بھی پاکستان میں مدغم ہونا چاہیے۔ انگریزی حکومت نے جبرِ تلوار کے زور سے تمام ایشیا کو غلام بنایا۔ اگرچہ ہم نے بغاوتیں کیں لیکن حکومتِ برطانیہ ایک جابر اور ظالم حکومت تھی۔ اس نے ہماری آزادی کو سلب کیا۔ ہمیں موت کا خوف دلایا جاتا ہے۔ گویا کہ ڈیڑھ کروڑ ایشیائی بلوچوں کی موت کی دستاویز پر ہم خود دستخط کریں۔ ہم اتنے بڑے جرم کے مجرم نہیں بن سکتے کہ بلوچ قوم کو ذلیل کر کے غیر بلوچ قوم میں مدغم کر دیں۔ ہم تاریخ کی نظروں میں ایسے مجرم نہیں بننا چاہتے جو بلوچوں کو غیر بلوچ علاقے میں لے جائیں۔ اگر پاکستان، خود مختار قوم کی حیثیت سے ہمارے ساتھ تعلق نبھانا چاہتا ہے تو ہم دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہیں اور اگر پاکستان ایسا نہیں چاہتا اور جمہوری قدروں کو پامال کرنا چاہتا ہے تو پھر ہر بلوچ اپنی آزادی کے لیے لڑے گا‘‘۔

(فقرے کا آخری حصہ ہی فرشتوں نے اچک لیا اور ہماری تقدیر میں شامل کر لیا۔ کم بخت، فقرے کے پہلے حصے کی رپورٹنگ ہی وہاں اوپر نہ کر سکے۔ تاش کی بازی میں مصروف پاکستانی سپاہیوں کی طرح!!)۔

عالی جاہ مولانا محمد عمر دیوبندی نے الحاق کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ’’عالی جاہ میر غوث بخش بزنجو نے جو تقریر کی وہ اگرچہ اس کی زبان اور حلق سے نکلی ہے لیکن درحقیقت اس نے ہر ایک بلوچ کے جو پہاڑوں میں رہتے ہیں، جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ میر غوث بخش نے جو کچھ کہا ہے وہ تمام بلوچ قوم کی آواز ہے‘‘۔ (اور یہی حقیقت ہے بلوچ تاریخ میں۔ آج تک وہی تقریر ہی منشور ہے بلوچ سیاسی ورکر کا!!)۔

عالی جاہ مولانا عرض محمد دیوبندی نے پاکستان کے لیے قلات کی وفادارانہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا، ’’حق تو یہ تھا کہ پاکستان کی حکومت ہم سے یہ کہتی کہ خاران، لس بیلہ اور مستجار علاقے کیا چیز ہیں پنجاب اور سندھ کے تمام بلوچی علاقے بھی لے جاؤ۔ مگر افسوس کہ اس کے برعکس پاکستان کی حکومت الحاق کے لیے ہم پر دباؤ ڈال کر ہماری آزادی سلب کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے ہم ہرگز تیار نہیں۔‘‘ مولانا نے کہا، ’’اگرچہ ہم کمزور ہیں لیکن:

ندانی کہ چوں گُر بہ عاجز شود
بر آ ردزِ چنگال چشمِ پلنگ

اسی طرح ہم بھی ایک کمزور بلی کی طرح ہی سہی، اگرچہ ختم ہوں گے، مٹ جائیں گے لیکن اپنے دشمن کا چہرہ ضرور نوچ لیں گے‘‘۔

عالی جاہ ملک فیض محمد یوسف زئی نے بھی عالی جاہ بزنجو کی طرح پاکستان سے الحاق کی سخت مخالفت کی۔ اس نے دلیل میں قلات کی آزاد حکومت کی تاریخ بیان کی، جہاں خان محراب خان نے قلات کی آزادی بچانے کے لیے اپنی جان دے دی اور ’’ان کے خون کے چھینٹے قلات کے پتھروں پر نقش ہیں‘‘۔ اِسی طرح اس نے خان میر ھذاداث خان کو یاد کیا جو خان قلات کی آزادی کے تحفظ کے لیے سولہ برس تک انگیزوں کی قید و بند میں رہا۔ ’’اب بھی انشااللہ قلات‘ اپنی آزادی کی حفاظت کرے گا‘‘۔

عالی جاہ مرزا خدابخش نے بھی الحاق کی مخالفت کی۔ آخر میں ضلع مکران کے عالی جاہ مولانا نور محمد اور عالی جاہ میر کنر خان نے بھی مقررین کی تائید میں پاکستان کے ساتھ الحاق کی مخالفت کی۔

پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے حق میں کسی ممبر نے بھی تقریر نہیں کی اور نہ ہی صدر کے دریافت کرنے پر کسی نے الحاق کی حمایت کی۔ چنانچہ دیوانِ عام نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ؛

’’پاکستان کے ساتھ معاہدہ کے ذریعے اس طرح تعلقات قائم کیے جائیں جس طرح دو آزاد حکومتیں ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ رنگ میں کرتی ہیں۔ الحاق کی صورت میں نہیں‘‘۔

تماشا تو دیکھیں کہ بعد میں آدھی صدی گزر جانے کے بعد، 1975ء میں جب نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کے قائدین پر غداری کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا تو میر بزنجو پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ نے دسمبر 1947ء میں بلوچستان کی پاکستان سے الحاق کی مخالفت کی تھی (28 سال پرانی بات!!...... بلوچی میں کہتے ہیں کہ ایک عورت ایک جگہ بیٹھ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی، ’’اس لیے رو رہی ہوں کہ پچھلے سال یہاں میرے خاوند کو چیونٹی نے کاٹا تھا‘‘)۔ تو 1975 میں 1947ء کے مقدمے کے لیے اپنے مؤقف کا دفاع اور اس تقریر کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپنے تحریری بیان میں میر صاحب لکھتا ہے؛

’’1666ء میں بلوچوں کے قمبرانی قبیلے کی ایک نمایاں شخصیت میر احمد نے مملکت قلات کا سنگِ بنیاد رکھا اور پہلے خان قلات کی حیثیت سے اُس نے 1695ء تک اس آزاد اور خودمختار مملکت پر حکومت کی۔ خان میر نصیر خان اول کے دور تک جو 1750ء تا 1795ء تک کا زمانہ تھا قلات جو اس وقت بلوچستان کے نام سے موسوم تھا، اس میں موجودہ پاکستانی و ایرانی بلوچستان‘ ڈیرہ غازی خان، خان گڑھ (موجودہ جیکب آباد)، کراچی اور ضلع دادو کا کوہستانی علاقہ شامل تھا۔ انگریز نے فارورڈ پالیسی کے تحت 1839ء میں بلوچستان پر حملہ کرکے خان میر محراب خان کو شہید کر دیا اور اس کی جگہ میر شاہنواز خان کو جو خوانینِ قلات کے خاندان میں سے تھا‘ کو خان بنایا۔ مگر میر محراب خان کے لڑکے نصیر خان دوم نے کئی لڑائیاں لڑ کر شاہنواز خان کو نکال کر دوبارہ اپنے والد کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ انگریز نے جب محسوس کیا کہ بلوچوں سے لڑ کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا تو اس نے خان میر نصیر خان کے ساتھ 1842ء میں معاہدہ کیا اور اس کے بعد 1947ء تک جب تک انگریز برصغیر پر قابض رہے، ان کے تعلقات قلات کے ساتھ مختلف معاہدوں کی صورت میں

رہے اور آخری معاہدہ 1876ء کا تھا جس میں سابقہ معاہدوں کی طرح قلات کی آزادی و خودمختاری کو آخر تک انگریزوں نے بحال رکھا۔ برصغیر میں نیپال اور قلات، صرف دو ریاستیں ایسی تھیں جن کے تعلقات براہِ راست حکومت برطانیہ کے ساتھ تھے۔ اور یہ دونوں ہندوستانی ریاستوں میں شمار نہیں ہوتی تھیں۔ 1947ء میں جب انگریزوں نے برصغیر کو چھوڑنے، اور، ہندوستان اور پاکستان کی دو آزاد خودمختار ریاستیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو 11 اگست 1947ء کو ایک اعلامیہ کے ذریعے جو دہلی سے نشر ہوا حکومتِ پاکستان نے حکومتِ قلات کی آزادی کو تسلیم کیا اور اس امر کو بھی تسلیم کیا کہ ریاست قلات ہندوستان کی ریاست نہیں بلکہ اس کے تعلقات براہِ راست حکومتِ برطانیہ کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے ہیں''۔

مگر استعمار کی کیا یاد اور کیا یادداشت!!۔ زورآور کے پاس دلیل کا ایک ہی نام ہے: ڈنڈا۔ چنانچہ ڈنڈا بازی سے بزنجو اور اس کے رفقا حیدرآباد جیل میں سڑتے گلتے رہے۔

آیئے لوٹتے ہیں واپس قلات کے جبراً الحاق کے وقت بزنجو کی قیادت میں بلوچ سیاست دانوں کے مؤقف کی جانب۔

دلچسپ بات ہے کہ دو تین ماہ کے اندر اندر اسلامی جمہوریہ پاکستان اپنے اس معاہدے سے پھر گئی، جس کے تحت ریاست قلات کی آزادی وخودمختاری کو گیارہ اگست 1947ء کے اعلانیہ کے مطابق پاکستان نے تسلیم کرلیا تھا۔ مذکورہ اعلانیہ پر محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خان دونوں کے دستخط موجود ہیں۔ اس دہلی کانفرنس منعقدہ 4 اگست 1947ء میں جناح صاحب اور لیاقت علی کے علاوہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، وائسرائے ہند لارڈ ازمے اور خان میر احمد یار خان شریک تھے۔

گیارہ اگست 1947ء کے اعلانیہ میں حکومتِ پاکستان نے قلات کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کیا۔ یہ دستاویزات حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ اور خان آف قلات کی تحویل میں ہیں۔

مگر، پاکستان بلوچستان کے پیچھے پڑا رہا۔ پتہ نہیں اُسے اپنے اندر پوری پوری قوموں اور پورے پورے ملکوں کو شامل کرنے کا شوق کس نے ڈال دیا؛ بھوک نے، رقبے کی کمی اور آبادی

کی زیادتی نے، خشکی میں گھرے رہنے نے، یا اللہ کی ناراضگی نے؟۔

پاکستان کے ساتھ الحاق کے زیرِ بحث مسئلے پر دیوانِ عام کے فیصلے پر غور وخوض کے لیے تین اور چار جنوری 1948ء کو دیوانِ خاص کا اجلاس منعقد ہوا۔ پہلے ممبروں نے حلف لیا۔ 4 تاریخ کو بحث ہوئی اور متفقہ رائے آئی؛

''.......... یہ دیوان پاکستان کے ساتھ الحاق کو جس سے بلوچ قوم کی جداگانہ ہستی کے ختم ہو جانے کا خطرہ ہے، قبول کرنے کو تیار نہیں''۔(19)

ایوان میں دیوانِ عام کی منظور کردہ اس تجویز کو بھی منظور کیا جس میں بلوچی کو قومی اور سرکاری زبان تسلیم کیا گیا تھا۔

25 فروری 1948 کو ڈھاڈر میں دیوانِ عام کا دوبارہ اجلاس طلب کیا گیا۔ اس اجلاس میں بھی بزنجو نے اپنے اکثر ساتھیوں سمیت اپنا فیصلہ برقرار رکھا:

''دیوانِ عام کا یہ اجلاس قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے گذشتہ اجلاس کے فیصلے پر قائم ہے کہ قلات ایک آزاد اور خودمختار حکومت کی حیثیت میں رہے''۔

یہاں بزنجو نے اپنی تقریر میں وہ فقرہ کہا جو ہم سب سے پوشیدہ رہا، مگر وہ بہت پیغمبرانہ پیش گوئی نکلی: ''پاکستان کے نظریہ سے ہم آگاہ ہوئے ہیں کہ، وہ دوستانہ تعلقات کی بنا پر کروڑوں روپے خرچ نہیں کرسکتا، البتہ ہم کو غلام بنا کر خرچ کرنا چاہتا ہے''۔

دیوانِ عام کے فیصلہ کے دو دن بعد دیوانِ خاص کا اجلاس 27 فروری 1948ء کو بلایا گیا۔ مقام وہی ڈھاڈر۔ دیوانِ عام کی طرح دیوانِ خاص کا بھی یہ دوسرا اجلاس تھا۔ البتہ اس میں فیصلہ ہوا کہ ''دیوانِ عام نے جو فیصلہ کیا ہے وہ فوری طور پر کیا گیا ہے جو نامکمل ہے۔ لہٰذا دیوانِ خاص کی طرف سے حکومت پاکستان سے کہہ دیا جائے کہ اس دیوان کو اس اہم ترین مسئلہ پر پوری طرح غور کرنے کے لیے تین مہینے کی مہلت دے..........'' (دھت تیرے کی.......... طبقاتی کردار، طبقاتی مؤقف!!)

11

بلوچستان پاکستان میں، اور، بزنجو جیل میں

مگر پاکستان کیوں تین ماہ دیتا؟۔ اس نے خفیہ خفیہ 17 مارچ 1948ء کو خاران، لسبیلہ اور مکران کا الحاق اپنے ساتھ کر دیا۔ اور مارچ 1948 کو بزنجو کو گرفتار کر کے خضدار جیل میں ڈال دیا گیا۔ (50 برس بعد ضیا نے بھی اسے خضدار جیل ہی میں ڈال دیا تھا۔ انقلابیوں کے لیے تو حکمران سب ایک سے ہوتے ہیں؛ خواہ اعلیٰ حضرت خانِ بلوچاں ہو یا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر پاکستان ہو)۔ الغرض میدان صاف تھا۔ خان اور سرداروں نے دنیا بھر کے بلوچوں کی اپنی آزاد ریاست کے شیریں آب کو تلخ بنا دیا اور اپنی موقع پرستی، بزدلی اور بے عقلی سے بلوچستان کو 27 مارچ 1948ء کو پاکستان کی جھولی میں ڈال دیا۔

آج تک نہ پاکستان اُسے نگل سکا ہے اور نہ بلوچوں کو قتل قتال سے نجات ملی ہے۔

خضدار جیل ہی میں قیدی بزنجو سے آغا عبدالکریم ملنے آیا اور اس کے بعد وہ افغانستان چلا گیا............اور جنگِ آزادی مختلف موڑ اور مراحل طے کرنے میں لگ گئی۔

اُدھر مسلم لیگ اپنی اصل شکل دکھانے لگی تھی۔ بے جڑ اور غیر منظّم مسلم لیگ جس کے لیڈر

بدترین اقربا پروری، خوشامد اور چاپلوسی کے عادی بن چکے تھے، اور سیاسی مخالفت کو سختی سے دبا دینے کی لت میں پڑ گئے تھے۔ اس صورت میں 1949-50ء، میں مسلم لیگ مختلف ٹکڑوں میں بٹنے لگی۔ پنجاب کے نواب ممدوٹ نے بسم اللہ کر کے جناح مسلم لیگ بنالی۔ عوامی مسلم لیگ بنالی مشرقی بنگال کے حسین شہید سہروردی اور مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے۔ عوامی مسلم لیگ کچھ عرصہ بعد لفظ ''مسلم'' کو نکال کر صرف عوامی لیگ بن گئی۔ جس سے آگے چل کر برصغیر کی ساری سیاست نے متاثر ہونا تھا۔

12

مسلم لیگ کا چولا بھی پہن کر دیکھا

پسماندہ سماج میں بزنجو جیسے انسان اپنے کاز کی خدمت کے لیے کیا کیا تجربے کرتے رہتے ہیں۔ اور پاکستان جیسی نوخیز ریاست نے یہاں قدم جمانے کو کیا کیا دولتیاں ماریں۔ مار کھانے' اور بار بار مار کھانے کے باوجود ہمارے خان، خان احمد یار خان کو مسلم لیگ سے ایک بار پھر قربت کا شوق چڑھا۔ چنانچہ اس نے میر اجمل خان مرحوم کے ذریعے میر غوث بخش اور گل خان نصیر سے رابطہ کیا۔ دونوں راضی ہوگئے۔ میر صاحب نے اس موقع اور پلیٹ فارم کو اپنے مقاصد اور خیالات کی اشاعت اور ترویج کے لیے سازگار سمجھا۔ اس لیے کہ انجمنِ وطن مر کھپ گئی تھی، قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی معدوم ہو چکی تھی۔ لہٰذا، میر گل خان اور میر بزنجو کا خیال تھا کہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر کے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے جدوجہد شروع کی جائے۔ ''چپ بیٹھنے سے کوئی فائدہ نہیں''۔ (20) ایک بحث میں میر گل خان مصر تھے کہ: ''جب آدمی کو سواری کے لیے کوئی گاڑی نہ ملے تو پیدل چل کر وقت ضائع کرنے میں کیا فائدہ؟'' (21)۔ (شریف آدمی! گھٹا ٹوپ اندھیروں سے روشنی مانگتا ہے!!)۔ بہر حال میر غوث بخش بزنجو نے بھی یہ کہہ کر کہ: ''مسلم لیگ کا

چولا پہننا ہی پڑے گا'' آنکھیں بند کر دیں اور دھڑام، چھلانگ لگائی مسلم لیگ کے صدیوں سے ٹھہرے، آکسیجن سے مبرّا تالاب میں۔ مسلم لیگ نے تو خدا دے اور بندہ لے، جھٹ سے میر صاحب کو ریاست میں مسلم لیگ کا کنوینر بنا ڈالا۔ اِدھر سیاسی ورکر، مسلم لیگ کو بڑی رسوائی سمجھتے تھے مگر میر صاحب نے عبداللہ جان جمالدینی، غلام محمد اور بہادر خان کو بھی سمجھا بجھا کر اس میں شامل کر دیا۔ یہ غالباً 1952ء کے سال کا آخر تھا۔ ڈھاڈر میں ایک کیمپ ہوا جس میں تمام بلوچ، سیاسی راہنما اور کارکن اسی پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ بہت بڑا جلسہ ہوا۔ بلوچ راہنماؤں نے تقریریں کیں۔ جن میں میر بزنجو اور گل خان شامل تھے۔ جلسہ ختم ہونے پر حسبِ توقع غلام جان شاہوانی، ملک فیض یوسف زئی اور عبداللہ جان کیمپ کے خیمے اور شامیانے اٹھا کر کوئٹہ واپس ہوئے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مستنگ اور قلات میں بھی جلسے کیے گئے۔ لیکن، بعد میں تجربے سے اسے معلوم ہوا کہ مسلم لیگ تو چلا ہوا کارتوس ہے۔ اس پلیٹ فارم سے اس کے مقاصد آگے نہ بڑھیں گے اور نہ ہی مسلم لیگ میں اس کی سیاست کی گنجائش تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس سے تو کچھ نہ ہو سکے گا۔

اُدھر اُس کے دوسرے ساتھی پشیمانی میں غلام جان شاہوانی کی قیادت میں خود اُس سے بغاوت کر گئے اور اُس سے عارضی طور پر الگ ہو گئے۔ (22)۔ پھر' میر صاحب بھی وہاں سے بس' نکل پڑا۔

اس سلسلے کا، ایک دوسرا بیانیہ بھی دیکھیے: الحاق کے کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی ریاست میں ''مسلم لیگ'' قائم کرنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ نور الامین کی سرکردگی میں ایک تین رکنی وفد کوئٹہ آیا اور قلات وغیرہ میں دورے شروع کیے۔ اس ٹیم کی آمد پر ''قلات نیشنل پارٹی'' نے اپنے تمام ممبران کو ہدایت کی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب پارٹی کے الیکشن ہوئے تو معلوم ہوا کہ ''مسلم لیگ'' کے بجائے تمام اہم عہدوں پر ''قلات نیشنل پارٹی'' کے لوگ کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس تین رکنی وفد نے دوبارہ پارٹی کو توڑ دیا اور اپنی رپورٹ میں یہ تحریر کیا کہ ریاست قلات میں سوائے ''نیشنل پارٹی'' کے اور کوئی پارٹی بن ہی نہیں سکتی۔ (23)

13

جیلیں، ریلیں

میر صاحب نے کل ملا کر تقریباً 25 برس جیل میں گزارے۔ ان کی کل زندگی 72 برس کی تھی، اس میں سے 25 برس جیلیں چھین کر لے گئیں، جوانی کے 25 سال، شعوری عمر کے 25 سال، متحرک عمر کے 25 سال۔ ہم کتنے ناترس لوگ ہیں کہ ایسی قربانیوں کو معمولی سی بات قرار دے کر آگے گزر جاتے ہیں۔ اس لیے اے میرے اچھے قاری! دو سطریں واپس جاؤ اور احترام سے دوبارہ پڑھو کہ میر غوث بخش بزنجو نے کل 72 سال کی اپنی زندگی کی ایک تہائی یعنی 25 برس جیل میں گزارے۔ جن میں قلی کیمپ بھی شامل ہے، جہاں کی عقوبت گاہ میں گزرنے والا ہر سیکنڈ صدی کے برابر ہوتا ہے۔

صرف ایک بار اسے کچھ لوگوں کے ساتھ قید رکھا گیا، وگرنہ ہمیشہ تنہائی کی جیل اسے دی گئی۔ بلوچستان کے مالک میر غوث بخش بزنجو کے متبرک ہاتھوں کو کرسیاں بُننے پر لگا دیا گیا، اُن سے قالین بُننے کی مشقت لی گئی۔ اور وہ دَریاں بنانے پر مجبور کر دیے گئے۔

جب بزنجو اپنے ساتھیوں سمیت جیل سے باہر آئے تو دنیا بدل چکی تھی۔ حکومتیں بن رہی تھیں، حکومتیں ٹوٹ رہی تھیں، سکندر مرزا تھا، ایوب خان تھا اور بدبختیاں تھیں۔

14

اُستمان گل

1954ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ پاکستان کو سیٹو اور سنٹو میں ''کارکنی'' کا درجہ مل گیا۔ اور جمہوریت بھاڑ میں ڈال دی گئی۔ 1955ء میں مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو توڑ کر اور ریاستوں کو ضم کر کے ون یونٹ بنا دیا گیا۔ ون یونٹ، جس نے اگلی پوری نصف صدی قوموں کو جیل خانے میں بند کر دیا۔ مگر اس لحاظ سے بلوچستان تو ایک صوبہ نہ تھا۔ بلوچ اور بلوچستان کو ون یونٹ میں ڈالنے کے لیے لازم تھا کہ بلوچستان اسٹیٹس یونین کو ضم کیا جائے۔ 31 دسمبر 1954ء کو عوام سے کچھ بھی پوچھے بغیر یہ معاہدہ بلوچستان پہ تھوپ دیا؛

اعلیٰ حضرت خانِ اعظم یونین کے حکمرانوں کی کونسل (بلوچستان اسٹیٹس یونین) کے صدر کی حیثیت سے اپنی 'سالمیت' اور اپنے سارے حقوق اتھارٹی اور اختیارات پاکستان راج کی حکومت کو تفویض کرتا ہے، بشمول اپنے سارے علاقوں کے جن میں لیز کے علاقے بھی شامل ہیں۔ (بلوچستان نہ ہوا' ایک خربوزہ ہو گیا..... 'تفویض' کرتا ہے!!)۔ اس معاملے میں اُسے حکمرانوں کی کونسل کے ممبروں یعنی مکران، لسبیلہ اور خاران کے حکمرانوں نے اختیار دے دیا ہے۔ وہ بھی اپنی

سالمیت اور اپنے سارے حقوق، اتھارٹی اور اختیارات سمیت ....Dominion کی حکومت (پاکستان) مذکورہ یونین حکمرانی کے حدود، اتھارٹی اور اختیارات جس طرح چاہے استعمال کرے گی اور جس ایجنسی کے ذریعے چاہے، کرے گی''۔

اس حتمی ہتھیار ڈال دینے کے آخری اقدام کے عوض ساڑھے چھ لاکھ روپے سالانہ خان قلات کو ملنے تھے، سوا دو لاکھ نواب مکران کو، دو لاکھ جام لسبیلہ کو اور ستر ہزار نواب خاران کو۔ بلوچستان سٹیٹس یونین کا وجود 14 اکتوبر 1955ء کو ختم ہو گیا۔

یہ تو بابا کی سیاست کی موت تھی۔ سماج کو پستی در پستی میں دھکیلا جا رہا تھا۔ چنانچہ میر غوث بخش بزنجو بلبلا اٹھا۔ اس نے خاموش نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا اور 14 جولائی 1955ء میں بزنجو نے آغا عبدالکریم خان، محمد حسین عنقا، میر گل خان نصیر اور قادر بخش نظامانی کے ہمراہ ''استمان گل'' قائم کی۔ (اس بلوچی لفظ کا مطلب ہے؛ ''عوام الناس کی پارٹی'')۔

آغا عبدالکریم خان اس پارٹی کا صدر منتخب ہوا اور محمد حسین عنقا سیکرٹری۔ پارٹی قیادت نے فیصلہ کیا کہ پارٹی کے صدر آغا عبدالکریم خان اور دوسرے عہدیدار جھالاوان کے علاقے کا دورہ کریں گے۔ مگر قلات کے وزیر اعظم نے اس دورے پر پابندی لگا دی۔ پارٹی نے اس پابندی کو توڑنے کا فیصلہ کیا۔ بزنجو صاحب اور گل خان نصیر کو جھالاوان سے قلات تک پیدل دورہ کرنے کی ہدایات ملیں۔ اور، '' راستے میں جو بھی اس مارچ میں شامل ہوتے جائیں، انھیں ساتھ لیا جائے۔ اور قلات میں جمع ہو کر جلسہ کیا جائے''۔

میر بزنجو اور میر نصیر جب خضدار سے قلات تک پہنچے تو جلوس ہزاروں تک پہنچ چکا تھا۔ قلات میں انسانوں کا سمندر اکٹھا ہوا۔ تین دن، تین راتوں تک پارٹی نے جلسے جلوس منعقد کرائے۔ ان ساری میٹنگوں میں خان عبدالصمد خان موجود تھا۔

قلات انتظامیہ بوکھلا گئی۔ مغربی پاکستان سرکار سے لاہور میں رابطہ کیا گیا۔ ''وزیر اعلیٰ خان صاحب خود قلات آیا تاکہ ہم سے بات کر سکے۔ دو دن تک مذاکرات ہوتے رہے۔ ڈاکٹر خان نے آغا صاحب کے دورے پر پابندی ختم کر دی۔ تب یہ سارا مجمع جھالاوان کے دورے پر گیا

اور دو ہفتوں تک وہاں جلسہ جلوس ہوتا رہا۔ پارٹی خوب مضبوط ہوئی''۔ (24)

1955ء میں بزنجو نے قومی اسمبلی میں نواب مکران میر بائی خان کے مقابلے میں کاغذاتِ نامزدگی داخل کیے تو اس کے کاغذاتِ نامزدگی اس لیے مسترد کیے گئے کہ اس وقت کی حکومت نے بلوچستان کے چھ لاکھ ریاستی باشندوں کو نظر انداز کر کے صرف چار والیوں کو حقِ رائے دہی کا اختیار دے رکھا تھا۔

1956ء میں مغربی پاکستان اسمبلی (ون یونٹ) میں میر بزنجو الیکشن ہارا، اس لیے کہ اس زمانے میں صرف جرگہ ممبروں کو ووٹ دینے کا حق تھا۔ اور جرگہ ممبر بھلا غوث بخش بزنجو کو کیوں ووٹ دیتے۔ وہ بزنجو، جو مراعات یافتہ لوگوں کے اس پورے نظام کو ڈھا دینا چاہتا تھا۔

15

پاکستان نیشنل پارٹی

1956ء میں ''استمان گل'' کو پاکستان نیشنل پارٹی میں ضم کر دیا گیا، جس میں صوبہ سرحد سے ''سرخ پوش''، پنجاب سے ''آزاد پاکستان پارٹی''، سندھ سے ''سندھ محاذ''، ''سندھ ہاری کمیٹی''، اور بلوچستان سے ''وَروَر پشتون'' نامی تنظیمیں اور پارٹیاں بھی ضم ہوگئیں۔

1956ء کے آئین سے ون یونٹ کو آئینی ضمانت فراہم کر دی گئی۔ پاکستان قوموں کے لیے مکمل طور پر ایک گنبد بے در بنا دیا گیا۔ روشن خیالی اور جمہوری انسانی حقوق کے لیے ہر دروازہ، دریچہ بند کر دیا گیا۔ ایک آزاد اور خود مختار ملک کو مکمل طور پر امریکی سامراج کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ ہر طرح کا سچ اور غیر جانب داری بلا معاوضہ رہن رکھ دی گئی۔ اِن حالات میں پاکستان کے سامراج دشمن اور قوم پرست رہنماؤں اور ملک کے کمیونسٹوں نے مل کر ایک سیاسی پارٹی بنانا چاہی۔ جس کے مشترکہ نکات یہ تھے؛

* ملک کو امریکی سامراج کے فوجی معاہدوں سے نکالا جائے۔
* اس کی خارجہ پالیسی کو آزاد، خود مختار اور غیر جانب دار بنیاد پر استوار کیا جائے۔

* ون یونٹ کو توڑ کر صوبے بحال کیے جائیں۔ وفاق اور صوبوں کے اختیارات کو صوبوں کے عوام کے حقِ خود اختیاری کی بنا پر متعین کیا جائے۔
* جاگیرداری نظام کو ختم کیا جائے، زمین کاشت کاروں میں از سرِ نو تقسیم کی جائے۔
* ملک میں بھاری اور بنیادی صنعتیں قائم کی جائیں، مزدوروں کو ٹریڈ یونین حقوق کی ضمانت دی جائے،

اور............

* خواتین کو مساوی حقوق میسر ہوں۔

16

نیشنل عوامی پارٹی

اگلے سال یعنی 1957ء میں نیشنل پارٹی ''نیشنل عوامی پارٹی'' بن گئی، اس لیے کہ مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی قیادت میں ایک بہت بڑا گروہ عوامی لیگ سے ٹوٹا اور آ کر اِس پارٹی میں شامل ہوگیا۔ بھاشانی کے مطالبے پر لفظ ''عوامی'' اس میں شامل کر دیا گیا۔

اس طرح نیشنل عوامی پارٹی (NAP) ملک کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔ ملک کے تمام ترقی پسند اور قوم پرست لوگ اس میں شامل تھے۔ ایک بہت ہی مقبول، عوامی اور اصولی پارٹی!!۔

اور یہی پارٹی، دراصل بزنجو صاحب اور اُس کے رفیقوں کی اصل سیاست کا پلیٹ فارم تھی۔ اس پارٹی نے ایک طرف تو اِس لیے متنازع بننا تھا کہ اندرونی طور پر یہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں فاشسٹ طرز اختیار کرنے سے کبھی نہ چُوکی، مگر ملکی سطح پر اس پارٹی نے بہت خوب صورت رول ادا کرنا تھا............سامراج دشمنی کا، پارلیمنٹ کی بالادستی کا، اور وفاقیت کا۔

17

پیشانی پہ وال چاکنگ

نیشنل عوامی پارٹی بہت تیزی سے پھیلنے اور مقبول ہونے لگی۔ خطرہ پیدا ہوگیا کہ اعلان شدہ الیکشن میں یہ پارٹی بھاری کامیابی حاصل کرے گی۔ چنانچہ اس خطرے کے پیشِ نظر اکتوبر 1958ء میں ایوب خان نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ اس وقت بلوچستان کے لوگوں کو اپنی جاری ایجی ٹیشن میں ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ نیپ کے جھنڈے تلے وہ ون یونٹ توڑنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ خان قلات کی گرفتاری اور لاہور کو منتقلی نے بلوچ قبائل کو حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا کر دیا تھا۔ اور پھر مارشل لا کے تحت آغا عبدالکریم کی گرفتاری، مقدمہ اور سزا نے بلوچوں کے غصے پر تیل چھڑک دیا۔

نواب نوروز خان کی قیادت میں زہری قبیلے نے بغاوت کر دی۔ حکومت نے جھالاوان میں فوج کو ایک شغل مہیا کر دیا اور وہاں فوجی کارروائی شروع ہوئی۔

آغا عبدالکریم کی گرفتاری کے بعد میر غوث بخش بزنجو کو نیپ بلوچستان کا صدر بنا دیا گیا تھا۔ میر غوث بخش ایوب، مارشل لا اور ون یونٹ تینوں کا مخالف تھا۔ وہ وسیع تر صوبائی قومی حقوق کا

حامی تھا۔اس نے مارشل لا اور ون یونٹ کے خلاف ایک تحریک شروع کردی۔

ہمارے بزنجو کو گرفتار کرلیا گیا اور دنیا کی اُس وقت کی سب سے بڑی اذیت گاہ، قلی کیمپ میں بند کردیا گیا۔

اس اثنا میں سرکار نے قرآن پر حلف لے کر نوروز خان سے وعدہ کیا کہ ان کے سارے مطالبات مذاکرات کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔ اس طرح انھیں پہاڑوں سے اتارا گیا۔ مئی 1959ء میں اُن کی واپسی پر اسے اور اُس کے ساتھیوں کو پکڑ کر قلی کیمپ جھونک دیا گیا۔ جہاں وہ ڈیڑھ سال تک رہے۔

میر بزنجو کو قلی کیمپ میں سخت ایذائیں دی گئیں۔قلی کیمپ دوسری عالمی جنگ کے دوران گرفتار شدہ جاپانی فوجیوں سے پوچھ گچھ کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔اس اذیت گاہ کو آرمی خود چلاتی تھی۔میر کو وہاں بہت مارا پیٹا گیا۔ بے قرآن لوگوں نے بلوچستان کے بابا کو کئی کئی دن تک دونوں بازو پہلو کی طرف لمبا کر کے دن رات کھڑا کیے رکھا۔ اُسے چھت سے الٹا لٹکا کر اُس پر لاٹھیاں برسائی جاتیں۔اور پانچ پانچ دس دس رات سونے نہ دیا۔انتہائی درجے کی سردی میں جب برف پڑ رہی ہوتی تو اس کے کپڑے اتار لیے جاتے' اُسے سیمنٹ کے فرش لٹا دیا جاتا اور ٹھنڈا پانی اوپر سے ڈالا جاتا۔......اسے الٹا لٹا دیا جاتا اور بڑے بڑے بوٹ پہنے سپاہی اُس کی پشت پر کھڑے ہو کر مسلسل اوپر اچھلتے اور واپس پیٹھ پر کھڑے ہو جاتے، پھر اوپر اچھلتے اور............(25) (بڑے آئے پاکستان کا مطلب کیا......والے!۔ایسا تو ہٹلر بھی نہیں کرتا تھا)۔

ایک سال کی اِس اذیت میں یہاں بند 250 انسانوں کے لیے ساڑھے چار کلو دال اور فی کس ایک چھوٹی چپاتی دی جاتی رہی۔ یہ مینو کبھی تبدیل نہ ہوئی............ جی ہاں ایک سال تک بزنجو اور اُس کے ساتھی کھانے میں ایک چھوٹی چپاتی پر گزارہ کرتے رہے۔ بلوچستان ایسے ہی نہ ملا تھا!

دس ماہ کے بعد انھیں اپنے پیسوں پر گڑ اور چنا خریدنے کی اجازت ملی۔

میر غوث بخش بزنجو ایک سال بعد رہا ہوا تو وہ قلی کیمپ میں بند لوگوں کے لیے وکیل کرنے میں لگ گیا۔اس تگ و دو سے سرکار پھر بھڑ گئی اور دو ہی ہفتوں بعد بابا پھر گرفتار، اور پھر قلی کیمپ۔اور

قیدِ تنہائی۔ چھ ماہ تک بابا بزنجو گالیوں، بوٹوں کی نوکوں اور تذلیل کی سیاہ دلدلوں میں بلوچستان، بلوچستان پکارتا رہا۔اور پھر اسے مچھ جیل شفٹ کر کے چھ ماہ قید اور پانچ کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ کوڑے نہیں تو دس ہزار روپے۔

عطا اللہ مینگل' میر گل خان کی زبانی کہتا ہے کہ،''وہ لوگ بزنجو صاحب کو دوسرے گرفتار لوگوں سے الگ کر کے لے گئے اور ٹارچر کرتے رہے۔ایک مہینے کے بعد جب وہ واپس آیا تو میں بزنجو صاحب کو پہچان نہ سکا۔وہ پہلے شیو کیا کرتا تھا۔اب میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ داڑھی میں آ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ کس کو پکڑ کر لا رہے ہیں۔ جب اس نے بات کی تو میں نے پہچانا کہ یہ تو غوث بخش بزنجو ہے۔وہ کہتا ہے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اس سے کہا کہ تمھاری یہ حالت انھوں نے کر دی ہے؟ تو وہ بولا کہ چھوڑ واس بات کو، ایسے معاملات میں سب چلتا ہے۔

اس فوجی اذیت گاہ سے لوگ تپ کر نکلے۔میر صاحب کی بہادری، ہمت اور دور اندیشی نے سب کو حوصلہ دیا۔میر صاحب اس کیمپ کا ہیرو تھا۔

مگر ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔ ہرا یرا غیرا عشاق کے قافلے میں شامل نہیں ہو سکتا۔ابھی اور عذاب، ابھی اور دکھ۔

نواب نوروز خان کو عمر بھر جیل کی سزا دی گئی اور اُس کے چھ پاک ساتھیوں کو سزائے موت سنائی گئی۔انھیں مچ جیل بھیج دیا گیا۔ان محبوب و معزز چھ بلوچوں کے نام یہ تھے؛

1- فرزند، میر بٹے خان

2- میر ولی محمد خان زرکزئی

3- میر بہاول خان موسیانی

4- میر مستی خان موسیانی

5- میر سبزل خان زہری

6- میر غلام رسول جتک

ان چھ کریم النفس انسانوں کو بعد میں حیدر آباد میں پھانسی پر چڑھایا گیا۔نواب نوروز خان سنٹرل جیل حیدر آباد میں 1964ء میں عمر قید بھگتے بھگتے فوت ہو گیا۔

نوروز خان اور اس کے کامریڈوں کو سزا ہو جانے پر آغا سلطان ابراہیم خان احمد زئی حکومت کے خلاف تحریک چلانے افغانستان چلا گیا۔ وہ راستے ہی میں ایک حادثے میں مارا گیا۔ اور قندہار میں دفن ہوا۔اسے افغانستان بھیجنے کے الزام میں بزنجو کا نام بھی شامل کر دیا گیا جو کہ ابھی ابھی مچ جیل سے رہا ہو گیا تھا۔ ہمارا بابا پھر گرفتار اور پھر قلی کیمپ۔ یہ قلی کیمپ میں اُس کا تیسرا پھیرا تھا۔اور پھر چھ ماہ وہی شستہ زبان فوج اور وہی بلوچ بیٹے کی تذلیل وتوہین وتشدد۔

خدایا! تم نے کیسی شایانِ شان قوم کو کیسے بے شرف لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا۔

چھ ماہ قلی کیمپ اور پھر کوئٹہ جیل اور تین ماہ بعد رہائی۔

18

پابندی شکنی

ایک بار میر غوث بخش بزنجو اور نواب خیر بخش مری مشرقی پاکستان گئے اور وہاں کے لیڈروں کو سیاسی صورت حال اور اپنے مؤقف سے باخبر کیا، جلسے کیے، پریس کانفرنسیں کیں ۔ چٹاگانگ جلسے کے بعد جب وہ ڈھاکہ پہنچے تو خیر بخش مری واپس کراچی روانہ ہوا اور بزنجو صاحب کچھ عرصہ مزید ڈھاکہ رکا۔ پھر جب بزنجو صاحب ڈھاکہ سے ہوائی جہاز پر کراچی پہنچا تو ائیر پورٹ پر قلات پولیس وارنٹ گرفتاری کے ساتھ موجود تھی۔ جہاز سے اترتے ہی میر غوث بخش کو گرفتار کر لیا گیا ۔ پاکستان کے مشہور سیاست دان، حسین شہید سہروردی بھی اس جہاز میں شریک سفر تھا۔میر بزنجو نے سہروردی کو خدا حافظ کہتے ہوئے کہا کہ میں اپنے گھر ،یعنی جیل جا رہا ہوں...... ائیر پورٹ پر عجلت میں سہروردی نے ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے اس کارروائی کی شدید مذمت کی اور آمریت کے خلاف نعرہ لگایا، اور میر بزنجو کی تعریف کی کہ اس کی پیشانی پر ایک شکن تک دکھائی نہیں دی، وہ جیل کو اپنا گھر کہتا ہے اور کہا کہ،''میر غوث بخش بزنجو ملک کی عظیم شخصیت ہے مگر اس کا گناہ یہ ہے کہ وہ ایک بلوچ گھرانے میں پیدا ہوا...... کاش وہ بنگال یا پنجاب کا لیڈر ہوتا تو اُس کی عظمت کا پتہ چلتا''۔(27)

بزنجو صاحب کو ایف سی آر کے تحت مچ اور حیدر آباد جیل میں دو سال کی مشقت والی سزا ہوئی۔

1962ء میں ایوب کے آئین کے تحت منعقدہ انتخابات میں نواب خیر بخش مری کوئٹہ سے اور سردار عطا اللہ مینگل قلات ڈویژن سے منتخب ہوگئے۔ انھوں نے قومی اسمبلی کو بلوچستان کے مسئلے پر اچھا خاصا استعمال کیا۔ بہت بہادری اور جرأت کے ساتھ انھوں نے بلوچ عوام کے مصائب کو بیان کیا۔

میر غوث بخش بزنجو اگست 1962ء کے اوائل میں قلی کیمپ سے رہا ہو کر کچھ روز کوئٹہ میں ٹھہرا۔ اسی ماہ کے دوسرے نصف میں نیپ راہنماؤں نے میٹنگ کی اور فیصلہ کیا کہ جنرل ایوب اور نواب کالاباغ کی کوئٹہ آمد کے موقع پر جلسہ جلوس ہوں گے۔

چنانچہ 22 اگست 1962ء کو جنرل ایوب کی کوئٹہ آمد کے موقع پر زبردست جلسے میں مارشل کی کارستانیوں اور مظالم کے خلاف مؤثر تقریریں ہوئیں۔ ایوب نے جوابی کارروائی کے بطور سردار خیر بخش مری اور سردار عطا اللہ مینگل کو اپنے اپنے قبائل کی سرداری سے برطرف کر دیا (جیسے وہ گریڈ سترہ کے سرکاری ملازم ہوں!!) اور اُن کی جگہ پر اپنے گھڑے ہوئے سردار بنا لیے۔ سردار بگٹی کے ساتھ پہلے ہی ایسا کیا گیا تھا۔

اگلے ہی دن نیپ کا ککری گراؤنڈ کراچی کا مشہور، بڑا جلسہ منعقد ہوا اور اس کے اگلے ہی دن سردار عطائاللہ مینگل کو گرفتار کیا گیا۔

اسی زمانے میں میر غوث بخش بزنجو نے چوتھی بار 1964ء میں متحدہ اپوزیشن کے امیدوار کی حیثیت سے قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ اُس کا مقابلہ برسرِ اقتدار مسلم لیگی امیدوار سردار دودا خان زرکزئی سے تھا۔ یہ مکران کی نشست تھی۔ پتہ نہیں اس ملک کو کون کون سی قرآن شکنی کی سزا مل رہی ہے!!...... یہاں اس معمولی سے الیکشن میں ڈی سی مکران ملک وارث اور نوابزادہ شہ عمر خان گچکی نے رائے دہندگان کو قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر میر بزنجو کو ووٹ دینے سے منع کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ ایوب خان کا تاریک دور تھا اور اُس زمانے میں رائے دہندگان بی ڈی

کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ سرکار کی ساری سڑاند بھری سازشوں کے باوجود میر بزنجو نے مکران کے کل 84 ووٹوں سے 57 ووٹ حاصل کر کے ملک وارث کے سارے وارثوں اور شہ عمر خان گچکی کے مربیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ مگر بقیہ حلقے میں فرشتوں نے ووٹ دے دے کر بزنجو کو ہرا دیا۔

ایوب اور فاطمہ جناح کے الیکشن میں وہ فاطمہ جناح کے انتخابی مہم کا بلوچستان میں انچارج تھا۔ مگر اسے جیل میں ڈال دیا گیا.......... بلوچستان میں نہیں، لے جا کر حیدر آباد میں۔

پانچویں بار 1965ء میں میر صاحب ضلع لسبیلہ میں ضمنی الیکشن کے اندر محمد ہاشم لاسی کے مقابلے میں مغربی پاکستان اسمبلی کے لیے الیکشن ہار گیا۔ یہاں پھر رائے دہندگان 'بی ڈی ممبر' تھے۔

چھٹی بار 22 مئی 1966ء کو میر غوث بخش بزنجو لیاری کوارٹر کراچی اور ضلع لسبیلہ کے قومی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں بڑے سرمایہ دار خان بہادر حافظ حبیب اللہ پراچہ کے خلاف الیکشن میں حصہ لے کر بھاری اکثریت سے جیت گیا۔

اسمبلی کے اجلاس کے بعد اواخر جون 1966 کو میر غوث بخش بزنجو کوئٹہ چلا گیا۔ وہاں اکبر بگٹی لاہور سے ایک مہر بنوا کر لایا تھا جس پر ''ون یونٹ توڑ دو'' لکھا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے نوٹوں پر یہ مہر لگایا کرتا تھا بلکہ دیگر دوستوں کے نوٹوں پر بھی۔ میر بزنجو، میر سیف الرحمٰن مزاری اور کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ اکبر بگٹی کے گھر بیٹھے تھے۔ بزنجو نے اگلے دن کراچی جانا تھا اور سیف الرحمٰن کو لاہور۔ چنانچہ پیسے دے کر اکبر بگٹی کے ملازم کو ٹکٹیں خریدنے سٹیشن بھیجا گیا۔ وہ ٹکٹیں اور بقایہ رقم لے آیا۔ سیف الرحمٰن نے اپنے بقایا جات جیب میں ڈال دیے اور میر صاحب نے اپنے۔ اگلے دن صبح کو پولیس نے میر صاحب کے ہوٹل کے کمرے پر حملہ کیا اور اُس کے پیسے چیک کیے تو پچاس روپے کا ایک نوٹ دیکھا، جس پر ''ون یونٹ توڑ دو'' کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ بات تو لاہور کی ڈکشنری میں کفر تھی اور کافر میر غوث بخش بزنجو تھا۔ (اس کافر کے ہر کفر کو اُس کی قوم عبادت سمجھتی ہے)۔ نوٹ قبضہ میں لیا گیا اور میر صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ (28) کہیں اکتوبر 1968ء میں اُس کی طرف سے دائر کرائی گئی رٹ پٹیشن لاہور ہائی کورٹ میں پیش ہوئی اور کورٹ نے بزنجو صاحب کو رہا کر دیا۔ اس طرح وہ سرگودھا جیل سے باہر نکلا۔

ساہیوال والوں نے اسے 14 سال کی سزا سنا کر ساہیوال جیل میں ڈال دیا۔

سائیں کمال خان شیرانی نے ون یونٹ والے مُہر کے اِس الزام کے بارے میں یوں لکھا:

’’میں اور مولوی محمد خان جیل میں اُس سے ملنے گئے۔ اس نے اپنی میٹھی پشتو میں کہا...........(سائیں کا دعویٰ ہے کہ سارے بلوچوں میں بزنجو کی پشتو میٹھی اور رواں تھی)،’’میں تو اس پر بھی تیار ہوں کہ اپنی پیشانی پر لکھ دوں کہ: ’’ون یونٹ توڑ دو‘‘۔(29)

بزنجو صاحب کی محنت سے نیشنل عوامی پارٹی بہت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ وہ پارٹی کی تعمیر اور پھیلاؤ میں جُتے تقریریں کر رہا تھا، جلسے، پریس کانفرنسیں منعقد کر رہا تھا، ممبر شپ مہم چلا رہا تھا۔ الغرض بزنجو بابا نے اُس دور میں بہت کامیاب اور اچھی سیاست کی۔

اِس دوران بے وقوف حکمرانوں نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ مجیب اور اس کی سیاست سے اختلاف کو فوج کے زور سے حل کرنے کی کوشش کی۔ ایک ہزار میل دور واقع بنگال پر اِس فوجی کارروائی کا نہ تو ملٹری سائنس میں کوئی جواز تھا اور نہ سیاسی لغت میں۔ تمام اچھے انسانوں نے اس فوجی کارروائی کی مخالفت کی۔ بزنجو اور رفقا کی نیشنل عوامی پارٹی کا موٴقف بھی اس بارے میں بہت ٹھوس انداز میں مخالفانہ تھا۔ یحییٰ خان ان لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا رہا۔ مگر ناکام ہوا۔ پتہ ہے حل کیا نکلا؟ حل یہ تھا کہ نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگی۔ پتہ ہے کہ الزام کیا تھا؟ وہی جانا پہچانا: ملک دشمنی۔

عجیب کھیل گاہ رہا ہے پاکستان۔ یحییٰ پابندی لگاتا ہے، بھٹو آ کر پابندی ہٹاتا ہے، مگر پھر وہ خود فوجی کارروائی بھی کرتا ہے اور اُسی پارٹی پر خود پابندی لگا دیتا ہے۔

بہرحال، بالآخر یحییٰ خان کو ون یونٹ توڑنا پڑا۔ بلوچستان کو صوبہ کا درجہ ملا اور ملک میں پہلی بار ہر بالغ مرد وزن کو ووٹ کا حق مل گیا۔

19

ناشُکرے لوگ

پاکستان کے حکمران اور اُن کے زیرِ اثر دانش ور اور عوام بہت بدقسمت رہے۔ انھیں مُلک لوٹنے کا طرز بھی نہ آیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو خود ہی ذبح کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان انھی حکمرانوں نے توڑا۔ 1971ء کے الیکشن کے نتائج نے بتایا کہ پاکستان میں موجود قوموں کا استحصال ذرا سا مشکل ہوگا تو انھوں نے وہ وجہ ہی ختم کی جو اُن کے لوٹ مار میں رکاوٹ ہو۔ ملک ہی توڑ دیا............آخری بچانے والے کون تھے؟ ولی خان اور بزنجو۔

وہ اپنا آخری دورہ کرنے اور کسی قسم کی مصالحت ڈھونڈنے 13 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ پہنچے۔ تینوں کو پتہ تھا کہ پنجاب مجیب کو اقتدار منتقل نہیں کرے گا۔ پھر بھی دونوں کے اصرار پر مجیب یحییٰ سے ملاقات کے لیے راضی ہوگیا۔ 16 مارچ کو یہ مذاکرات ہوئے۔ یحییٰ نے مغربی پاکستان کے لیڈروں کو بھی بلایا۔ بھٹو کی نمائندگی میں پنجاب نے اِن مذاکرات کا بھٹہ بٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور مجیب نے 24 مارچ کو اپنے مہمانوں بزنجو اور ولی سے کہا کہ اُن لوگوں کا ڈھاکہ میں مزید رہنا خطرناک ہوگا، اس لیے کہ اگلے دو دنوں کے اندر اندر فوجی کارروائی کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

25 مارچ کو ہمارا یہ سفارتی مشن استحصالیوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام واپس لوٹا اور پاکستان، مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔

20

چانسلر بزنجو

چنانچہ یحییٰ دور میں 1970ء کے اندر جو الیکشن ہوئے، اس میں بزنجو نے خان قلات شہزادہ محی الدین بلوچ کا مقابلہ کیا اور مکران' خاران اور لسبیلہ کی نشست پر قومی اسمبلی کی سیٹ پر کامیابی حاصل کی۔ یہ بزنجو صاحب کا ساتواں الیکشن تھا۔ ان انتخابات میں صوبہ بھر میں پیپلز پارٹی کو ایک بھی سیٹ نہیں ملی، جب کہ بزنجو کی پارٹی بلوچستان میں سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری۔

الیکشن کے بعد اقتدار کی ریوڑیاں بٹ رہی تھیں۔ مگر بزنجو صاحب نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اُس منحوس تکون میں شامل نہ ہوگا جو بھٹو، قیوم خان اور یحییٰ خان نے مل کر بنائی تھی۔ اس نے کیا خوب صورت بات کی تھی:

'' بھٹو، قیوم خان اور یحییٰ خان ایک دسترخوان بچھا کر اور بیچ میں ایک ڈونگے میں غلیظ چیز ڈال کر کھا رہے ہیں۔ اس میں شریک ہو کر کوئی بھی ذی ہوش اپنا دامن داغ دار نہیں بنائے گا'' (30)

چنانچہ نیپ علیحدہ رہی اور چور دروازے والی سیاست میں شامل نہ ہوئی۔ بھٹو نے بالآخر نیپ سے مذاکرات کیے اور ان کا جمہوری مینڈیٹ تسلیم کیا۔

مارچ 1972ء میں نیپ اور پیپلز پارٹی کے بیچ وہ معاہدہ ہوا جس میں تسلیم کیا گیا کہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کی اکثریت ہے اور وہاں صوبائی حکومتیں اُس پارٹی کی ہوں گی۔ چوں کہ اُس وقت تک صوبائی حکومتیں ملک میں نہیں بنی تھیں اور تمام صوبوں میں گورنروں کی حکومتیں قائم تھیں، اس لیے بلوچستان اور سرحد میں گورنریاں اس پارٹی کو ملیں۔ اس طرح نیشنل عوامی پارٹی کی جانب سے میر غوث بخش بزنجو 1972ء میں بلوچستان کا گورنر بنا۔

ایک سیاسی ورکر کے گورنر بننے کا ذائقہ ہی اور ہوتا ہے۔ بزنجو صاحب کی گورنری کے بعد سے لے کر آج تک پھر ہمیں کبھی کوئی سیاسی کارکن بطور گورنر نہ ملا۔ چالیس برس سے ہم سرکاری گورنروں کی بے ذوقی میں مبتلا ہیں۔ آیئے ایسے ہی، ذرا سا بلند ثقافتی کا ذائقہ بھی چکھ لیں۔ عملی طور پر نہ سہی تاریخ پڑھ کر ہی دیکھ لیں کہ ایک اچھا گورنر کیسا ہوتا ہے۔ آیئے بڑے انسان میر غوث بخش بزنجو کی اُس بڑی بات کو دہرائیں جو اس نے گورنر بلوچستان کی حیثیت سے جولائی 1972ء میں اہلِ مکران سے خطاب کے دوران کہی تھی؛

''جس وقت میں آپ لوگوں کے پاس ووٹ مانگنے آیا تھا، تو اسی قد و کاٹھ کے ساتھ آیا تھا۔ اور آج بھی میرا قد و کاٹھ، پوشاک اور واسکٹ وہی ہے۔ فرق یہ ہے آج میرے ساتھ آفیسر، پولیس، لیویز اور مصاحبوں کی فوجِ ظفر موج موجود ہے۔ یہ سب تمہارے خادم اور خدمت گزار ہیں۔ اور میں خود تمہارا خادم ہوں۔ تم ہی اس ملک کے مالک اور اقتدار کا سرچشمہ ہو۔ تمہاری طرف سے یہ اقتدار میرے پاس امانت ہے''۔(31)

یہیں پر بزنجو نے سرکاری افسروں سے خطاب کے دوران (اِسی جولائی 1972ء) میں کہا تھا:

''اگر دو فرد کسی جرم کے مرتکب ہو جائیں جن میں سے ایک مجرم کا تعلق ہماری پارٹی سے اور دوسرے کا کسی اور پارٹی سے ہو تو ہماری پارٹی کو زیادہ سزا دی جائے۔ تا کہ ہماری پارٹی کا کوئی فرد اپنے آپ کو شترِ بے مہار تصور نہ کرے۔''(32)

اس گورنر کو بلوچستان یونیورسٹی کی چانسلری بھی ملی اور اس نے یہ یونیورسٹی بنا ڈالی۔ اس

نے بولان میڈیکل کالج کا بھی سنگِ بنیاد رکھا۔ میر غوث بخش بزنجو نے اِس دھرتی کے سب سے اچھے استاد پروفیسر کرار حسین سے درخواست کی کہ وہ کراچی سے آ کر بلوچستان یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنے۔ اور جب کرار صاحب کوئٹہ آیا تو بجائے اس کے کہ وہ جا کر گورنر سے ملاقات کرے، گورنر بزنجو خود چل کر اُس کی رہائش گاہ آیا۔ پروفیسر نے پیار سے احتجاج کیا کہ میں آ جاتا تو بزنجو نے یہ آفاقی جواب دیا؛

I am a dispensible Governor and you are an indispensible teacher

(میں ایک ختم ہو جانے والا گورنر ہوں اور آپ ایک لازوال استاد)۔(33)

بزنجو صاحب نے کمال مہارت سے بلوچستان یونیورسٹی اور بولان میڈیکل کالج کے تمام استاد، (جی ہاں تمام استاد) باہر سے منگوائے۔ اب تک ان دو اداروں سے ہزاروں ڈاکٹر وکیل، صحافی، انجینئر اور اساتذہ نکلے جو نہ صرف بلوچستان بلکہ پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر بھی امتیازی علم، رویہ اور شائستگی کا ریکارڈ بناتے ہیں، ہر سال۔ بلوچستان کا ابھرتا ہوا مڈل کلاس!!۔

لگ بھگ ایک سال تک وہ بلوچستان کا گورنر رہا۔

21

چاند پہ داغ

بلوچستان دلچسپ تضادات کی سرزمین ہے، جسے سمجھنے کے لیے غالباً یہاں رہنا ضروری ہے۔ تاریخ میں ہم بلوچوں کا سب سے بڑا اور تقریباً مستقل تضاد تو بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ رہا ہے۔ جو اپنی شیطانی روحانی بھوک (جو پیٹ کے بھوک ہی کی پیداوار ہوتی ہے) مٹانے ہمارے پہاڑوں، میدانوں کو تاراج کرتے رہے ہیں (اور کر رہے ہیں)۔ تقریباً ہماری ساری شاعری، ادب، اور تاریخ ہمارے اِس طرزِ بود و باش بن جانے والے مظہر کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اور لگتا ہے کہ جب تک یہ بیرونی حریص آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں ہمارا پسماندگی کا عذاب کبھی دور نہ ہوگا۔ غلامی سب سے بڑی پسماندگی ہوتی ہے اور پسماندگی سب سے بڑا عذاب۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارا اپنا سماج بھی اپنے اندرونی تضادات رکھتا ہے۔ اس زندہ متحرک اور چلتے پھرتے سماج کے اندر سب سے بڑا تضاد طبقاتی ہے۔ چوں کہ یہ سماج فیوڈل اور قبل از فیوڈل سماج ہے، اس لیے تضاد فیوڈل اور عوام کے بیچ ہی ہوگا۔ یہ تضاد بہت ہی واضح تو نہری بلوچستان میں ہے مگر اس کا ایک بہت بڑا مظاہرہ 1972ء میں جھلاوان سب ڈویژن کے جھل جھاؤ کے علاقے میں عین اُس وقت اپنے عروج پر پہنچا جب میر غوث بخش بزنجو گورنر تھا۔ یہ مسئلہ

وہاں کے کاشتکاروں اور سردار خیل کے درمیان پیدا ہوا۔ سردار خیل کی اکثریت کا تعلق بزنجو قبیلے سے تھا۔ اس معاملے نے ایک شدید تنازع کی صورت اختیار کی جس سے جھلاوان کے دیگر علاقے بھی متاثر ہوئے اور یہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔

ہوا یوں کہ الیکشن کے دوران نیشنل عوامی پارٹی کے امیدواروں نے ششک کے معاملے کو اپنی الیکشن مہم کا حصہ بنا لیا۔ کاشت کار عوام کے لیے یہ زندگی بخش وعدہ تھا۔ اس لیے انھوں نے بڑی تعداد میں انھیں ووٹ دے کر کامیاب کیا۔ مگر جب فصل تیار ہوئی اور بٹائی کا وقت آیا تو کاشت کاروں کو حیرت ہوئی کہ یہ سردار زادے ششک سے دست بردار ہونے کے بجائے ششک وصول کرنے آن دھمکے۔

کاشتکاروں کا ایک وفد قومی اسمبلی کی سیٹ جیتنے والے جناب غوث بخش بزنجو کے پاس گیا مگر اس نے کہا کہ، ''ششک تو ہماری جدی میراث ہے، اسے کسی صورت نہیں چھوڑ سکتے''۔ کاشت کار مایوس لوٹے اور ششک دینے سے انکار کر دیا۔ پولیس اور ملیشیا جھل جھاؤ بھجوادی گئی اور کاشت کاروں پر گولی چلا دی گئی۔ جس سے کریم داد چنال نامی ایک کسان ہلاک ہو گیا۔ آواران میں بھی ایسی ہی صورت حال پیدا ہوئی۔ اور چند افراد مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ (34)

15 فروری 1973ء میں گورنر کے عہدے سے سبک دوشی کے بعد میر بزنجو کو نیشنل عوامی پارٹی کی جانب سے قومی اسمبلی میں پارلیمانی قائد بنایا گیا۔ اسی دوران 1973ء میں قومی اسمبلی نے بورژوا وفاقی اور جمہوری آئین تیار کیا۔ اس آئین کی تیاری میں میر صاحب نے بہت سرگرم حصہ لیا۔ وفاق اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور عوام کے حقِ خود اختیاری کی بنیاد پر صوبوں کی برابری کے حقوق کے لیے میر غوث بخش بزنجو کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ایک بار سی آر اسلم نے مجھے بتایا تھا کہ آئین میں ایک فقرہ موجود ہے: ''ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا جائے گا اور کام کے مطابق معاوضہ''۔ سی آر اسلم نے انکشاف کیا کہ یہ شق بزنجو صاحب نے ڈلوائی تھی۔ یہ فقرہ ہم لوگ لفظ 'سوشلزم' کے متبادل کے بطور استعمال کرتے ہیں۔ کمیونسٹ اصولوں اور جمہوری سیاست سے اُس کی کمٹ منٹ بغیر کسی تبدیلی کے قائم رہی۔ بڑا انسان تھا بزنجو!!۔

22

قیدی چانسلر

دوسروں کے تابعدار، مگر اپنوں پہ بدترین آمریت کی حکمرانی والے اس ملک میں روز تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ نئے سے نئے ایڈیشن، اور نئے سے نئے ماڈل کا ڈرامہ۔ بھٹو نے نیپ سے کیا ہوا اپنا معاہدہ توڑتے ہوئے بلوچستان اور سرحد سے نیشنل عوامی پارٹی کے گورنروں کو برخواست کیا۔ ایک نئی سیاست کی ابتدا تھی یہ، ایک نئی تباہی کی شروعات تھی یہ۔ ذرائع پیداوار کے مالکوں کے ہاتھوں پیداواری قوتوں نے پاکستان بھر میں پسپائی اختیار کرنی تھی۔ ہم اس کی تفصیل کیا بتا پائیں گے، بزنجو صاحب کی مارچ 1973ء میں قومی اسمبلی میں کی گئی تقریر کے اقتباس سے سب بات واضح ہوجائے گی......

''ہمارے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ ہم خود ایک تاریخ ہیں۔ ہم اس ملک کی تاریخ ہیں۔ ہم نے ظالم کے سامنے، آمریت کے آگے، پیسے کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا۔ آپ ہماری ساری سیاسی تاریخ میں یہ داغ نہیں دیکھیں گے۔

''اگر گولڈ اور گن اور دباؤ سے ہم اپنے اعتقادات چھوڑتے تو ہمیں اتنی مار نہ پڑتی۔ ہم

نے تو مار اِس لیے کھائی ہے کہ ہر مقام پر اور ہر وقت ہم نے حق کی بات کی ہے اور ہماری متاعِ زندگی یہی تاریخ ہے، یہی جیل ہے۔ ہماری کوالیفی کیشن ٹارچرز ہیں جو ہمیں اِن حاکموں کے ہاتھ سے مہیا ہوتے رہے ہیں۔ اب بھی اگر ایسی صورت بنتی ہے تو برادر! اس میں کوئی گلہ نہیں کیوں کہ ہم تو پہلے ہی سے خانہِ انوری ہیں۔ بھائی آسمان سے اگر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے خواہ وہ خان قیوم خان کے لیے بھی ہو، جب وہ زمین کے قریب پہنچتی ہے تو ہمارا گھر تباہ کرتی ہے۔ تو اس لیے ہمیں یہ گلہ نہیں کہ آج پی پی جس کی سربراہی ہمارے ایک ذاتی دوست اور ہمسایہ کر رہے ہیں، اگر وہ بھی حاکموں کی سنت ادا کرے تو ہم اس کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم بھی اپنی سنت ادا کریں گے''۔

چنانچہ بلوچستان میں بڑے پیمانے پر فوج کشی شروع کر دی گئی، ایک عدد لندن پلان بنایا گیا، اور عراقی سفارت خانے سے اسلحہ برآمد کیا گیا............ پتہ نہیں کیا کیا الزامات ایجاد و اختراع کر کے نیشنل عوامی پارٹی پر پھر پابندی لگا دی۔ یہ 1971ء میں یحیٰی خان کی طرف سے پارٹی پر پابندی لگانے کے بعد تیسری دفعہ تھی کہ اس پارٹی کو بَین کیا گیا۔

بلاشبہ ششک جیسے ناروا ٹیکس کے معاملے پر پارٹی جاگیرداروں کے ساتھ تھی اور اس نے کسانوں پہ بے انتہا مظالم کیے۔ ایک زبردست کسان تحریک ششک ٹیکس کے خلاف ابھری۔ جسے نیپ کی حکومت نے بہت متشدد سرکاری وسائل سے مارنا شروع کیا۔ یہ بہت ہی داخلی معاندانہ تضاد تھا اور یہ جدوجہد بلاشبہ خود کسانوں کی اپنی شروع کردہ تھی۔ البتہ پارٹی پر پابندی اور لیڈروں کی گرفتاری سے قبل نیپ حکومت کے خلاف پٹ فیڈر میں پنجابیوں کی زمینوں پر قبضہ، بلوچ پشتون فساد، بلوچستان سول سیکرٹریٹ پر اکبر بگٹی کے لشکر کا حملہ، دودا خان زرکزئی کی جانب سے جھالاوان میں ایک متوازی حکومت چلانے، پنجابی ملازموں کے بلوچستان سے نکال باہر کرنے جیسے تمام واقعات میں کسی نہ کسی طور بھٹو کی مرکزی حکومت کے ملوث ہونے کے شواہد سامنے آتے رہے۔

ان سب واقعات کے بعد پارٹی پر پابندی لگا دی گئی اور وزارت برطرف کر دی گئی۔ دوسرا گورنر اور دوسرا وزیر اعلیٰ لگا دیا گیا۔ پارٹی رہنماؤں کے خلاف حیدرآباد سازش کیس سامنے آیا اور جیل پھر ان کا مقدر بنی۔ میر غوث بخش بزنجو کو 1973ء کے 13 اگست کو قومی اسمبلی ارکان کے

ہوٹل سے اُس وقت گرفتار کرلیا گیا جب وہ ایک غیر ملکی اخبار نویس کو انٹرویو دے رہا تھا۔ یہ اخبار نویس ایک فرانسیسی خاتون تھی جو گرفتاری کے لیے پولیس کی بھر مار اور اس رویہ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ قومی اسمبلی کے کسی رکن کو اس طرح بھی گرفتار کیا جاتا ہوگا۔

چنانچہ اُس شخص کو جیل بھیج دیا گیا جس نے پاکستان کے آئین کی تیاریوں میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ بزنجو نے تو خود کو گرفتار کرنے والے وزیر اعظم بھٹو سے بھی زیادہ آئین پاس کرانے میں حصہ لیا تھا۔احسان فراموش سرکار!!

میر صاحب کو پہلے سہالہ اور PIDC ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا۔ جہاں بعد میں سردار عطا اللہ مینگل اور نواب خیر بخش مری بھی پہنچا دیے گئے۔مگر پھر بعد میں ان سب کو الگ الگ جیلوں میں بھیج دیا گیا۔سردار مینگل کو ساہیوال جیل پھینک دیا گیا،نواب مری لائل پور جیل کے حوالے ہو گیا،اور بزنجو کو میانوالی روانہ کر دیا گیا۔

انھیں ایک بار پھر' جون 1974ء کو سہالہ میں جمع کیا گیا، جہاں جیل ہی کے اندر ہائی کورٹ کا اجلاس منعقد ہوتا تھا۔ وہاں سے میر صاحب کو اوتھل لایا گیا۔ پھر سہالہ کیمپ جیل اور پھر وہاں سے مچھ جیل اور بالآخر اسے حیدر آباد جیل پہنچا دیا گیا............عشق پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا!!

میر بزنجو اور اُن کی رفقا کی 1973ء میں ہونے والی یہ گرفتاری اس وقت تک چلی جب تک کہ جولائی 1977ء کو بھٹو کی نیم سویلین' نیم فوجی حکومت کا تختہ ضیا نے الٹ دیا۔ساڑھے چار برس جیل میں رہ کر میر صاحب اُس وقت باہر آیا جب 5 فروری 1978ء کو سارے حیدر آبادی رہا ہوگئے۔

23

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی

حیدر آباد جیل کے دوران ہی بزنجو صاحب اپنے بلوچ دوستوں اور رفیقوں سے فکری طور پر بہت دور نکل گیا۔جیل میں بحثیں' باتیں اور مذاکرے ہوتے رہے اور رفتہ رفتہ سوچوں میں، نصب العین میں، اور داؤ پیچ میں موجود اختلافات وسیع ہوتے چلے گئے۔حتیٰ کہ رہائی کے وقت میر غوث بخش بزنجو اور نواب خیر بخش مری کی راہیں بالکل ہی جدا ہوگئیں۔

جب حیدر آبادی جیل سے رہا ہوئے تو صورت حال تبدیل ہو چکی تھی' اندر بھی اور جیل کے باہر کی بھی۔خان عبدالولی خان سب سے پہلے این ڈی پی میں شامل ہوا۔واضح رہے کہ ابھی ''کالعدم'' نیپ کے رہنما حیدر آباد میں ہی تھے کہ 1975ء کی خزاں میں سردار شیر باز مزاری نے نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی (این ڈی پی) بنالی تھی۔ ولی خان کے شامل ہونے کے کچھ عرصہ بعد میر غوث بخش بزنجو بھی اس میں شامل ہوگیا۔سردار عطا اللہ مینگل بھی کچھ عرصے کے لیے این ڈی پی میں شامل ہوا، البتہ نواب خیر بخش مری نے ایسا نہ کیا۔وہ تو پاکستانی پارلیمانی سیاست سے مکمل طور پر بے زار ہوگیا اور وہ پارٹیوں، الیکشنوں اور قرار دادوں کو بلوچ حق کے انکار کی صورتیں قرار دے کر

روایتی بلوچ مزاحمت کا طرز چُن بیٹھا............گویا مسلمہ اور بزرگ بلوچ لیڈرشپ اب اکٹھی نہ رہی۔

کچھ ہی عرصہ بعد ولی خان کے ساتھ بھی مستقل رفاقت مختصر ہوگئی اور بزنجو اُس سے الگ ہوگیا۔ مگر کس قدر پاک تھے اختلافی نکات؛ افغان انقلاب۔ جی ہاں، افغان انقلاب جس کے بارے میں ولی خان کا رویہ مخالفانہ تھا۔ وہ نور محمد ترہ کئی کی انقلابی حکومت کی مخالفت کرتا تھا جب کہ بزنجو افغانستان کے جمہوری انقلاب کا زبردست حامی تھا۔ شیر باز مزاری نے تو اِس انقلاب کو مسلمانوں کا کشت وخون قرار دے کر اس سے اپنی برہمی کا اظہار کیا تھا۔ اب بھلا کوئی عقلِ سلیم رکھنے والا کوئی شخص تا دیر ایسے لوگوں کے ساتھ رہ سکتا تھا؟۔ نیز مارشل لا کے بارے میں بھی این ڈی پی والوں کے دل میں نرم گوشہ تھا جب کہ بزنجو مارشل لا کی مخالفت کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ بزنجو صاحب زیادہ واضح ہو کر ترقی پسندانہ سامراج دشمن کردار ادا کرنا چاہتا تھا۔

24

پاکستان نیشنل پارٹی

بزنجو صاحب اور اُس کے رفقا نے این ڈی پی چھوڑ دی اور اس کی جگہ پہ ایک اور پارٹی یعنی پاکستان نیشنل پارٹی قائم کی۔ چوں کہ 50ء کی دہائی میں نیشنل عوامی پارٹی بنانے کے بعد بزنجو صاحب نے پہلی بار نسبتاً ایک بلوچ یا بلوچستان کی پارٹی تشکیل کی تھی۔ اس لیے 40 برس بعد دوبارہ بلوچستان میں، اور بلوچستان پہ زیادہ مرکوز نیشنل پارٹی میں ہمیں بلوچ سیاست بالعموم اور بزنجو صاحب کے سیاسی ارتقا کے بارے میں بالخصوص، خوب اندازہ ہوتا ہے۔ اس پارٹی کا منشور، پروگرام اور اس کی سیاست مکمل طور پر میر غوث بخش بزنجو کی سوچ کے مطابق تھے۔ یہ گویا قلات نیشنل پارٹی کا دوسرا جنم تھا جو چار دہائیاں یہاں وہاں گھما کر بزنجو کو دوبارہ وہیں لایا۔ اس ملک میں ان مذکورہ چالیس سالوں تک ایک انچ کی بھی تبدیلی نہ آئی تھی۔ لتا منگیشکر کا گانا یاد ہے، ناں؟

؎ تم نہ بدلنا، لاکھ بدلے یہ جہاں

لہٰذا فریم ورک وہی رہا بلکہ اُس سے بھی قدرے پیچھے سُرک گیا تھا۔ قدامت پرستی پاکستانی سیاست کا خشتِ اول ٹھہری، اور امریکہ پرستی اُس کا آکسیجن۔ سی آر اسلم کے کمیونسٹ بہت

کمزور تھے۔ بورژوا سیاسی تشکیل کے اندر بزنجو صاحب وہ واحد سیاست دان تھا، جس کی پالیسی اور لائحہ عمل انسانوں والے تھے۔ڈٹا رہا اپنے ایمان پر۔

اس لمبی جدوجہد کی وارث پارٹی کے پانچ اصول تھے؛ یہ پارٹی ایک جمہوریت پسند پارٹی تھی۔ سارے مذاہب کی آزادی کی علم بردار سیکولر پارٹی تھی ۔ سامراج دشمن تھی ، قومی جمہوریت پہ یقین رکھتی تھی اور ملک کے اندر قوموں کے حقوق کی علم بردار تھی۔

25

ضیاالحق

تصور کرلیں ضیاالحق کے اُس احسان کا جو اس نے بزعمِ خود' حیدرآباد کے قیدیوں کو رہا کر کے اور پوری سازش کیس ختم کر کے کیا تھا۔مگر کیا کیا جائے کہ سیاست اُس کی بھی غلط تھی۔ بزنجو اور اس کے رفقا اِسی غلط سیاست کے سامنے کلمہِ انکار کے سبب ہی تو بھٹو کی جیل میں تھے۔اب ضیا اُسی سامراج نوازی اور بدترین آمریت کے ساتھ پاکستان پر مسلط تھا۔ بھلا نیشنل پارٹی کیوں رعایت کرتی اُس سے؟۔اس کی تو بھٹو سے بھی بری صورت حال تھی۔ بھٹو کم از کم الیکشن کے ذریعے تو آیا تھا، یہ موصوف تو عالمِ بالا سے بس کود پڑا ہمارے نرخروں پہ۔اس کے علاوہ اس نے دائیں کھڑے ہوکر بائیں لاتیں مارنی شروع کردیں۔کون شریف آدمی اُس کی مخالفت نہ کرتا؟۔

میر غوث بخش بزنجو جنرل ضیا کی طرف سے آئین میں آٹھویں ترمیم کے خلاف تھا۔اور خواتین کے حقوق کے منافی تمام قوانین کی منسوخی چاہتا تھا۔ وہ اس خطے میں امن کا علم بردار تھا اور پڑوسی ممالک سے پُرامن بقائے باہم کی بنیاد پر تعلقات استوار کرنے کے حق میں تھا۔ وہ امریکہ کی معاشی غلامی سے نجات چاہتا تھا اور امریکہ سے خصوصی تعلقات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ پاکستان کی

خارجہ پالیسی کو آزاد، خودمختار اور ناوابستہ بنانا چاہتا تھا۔

میر غوث بخش بزنجو مارشل لا مخالف تھا۔ وہ تو سیاست اور سیاسی عمل کا آدمی تھا۔ جمہوریت میر صاحب کا ایمان تھی۔ یہی سبب ہے کہ مارشل لائی حاکموں کے پہلو کا یہ پتھر ہمیشہ جیلوں میں پھینک دیا گیا۔ اپنی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ یہ شریف انسان جیلوں میں چنگھاڑتا رہا۔ مستنگ سے لے کر میانوالی تک میر صاحب نے بہت سارے مہمان خانے بسائے۔ آزادی کے اس عاشق، اور جمہوریت کے اس چیمپئن کی ذات پر پہلے پہل انگریز' اور بعد میں پاکستان اور بلوچستان کے حاکم اس قدر عاشق تھے کہ ''روٹی کپڑا'' بھی مفت دیتے رہے اور ''مکان'' کا بندوبست بھی مفت کیے رکھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ایک ربع صدی تک میر غوث بخش بزنجو نے ''روٹی کپڑا اور مکان'' کا مفت مزہ لیا۔ مگر پھر بھی نال کا یہ بڑا انسان اپنے عقیدہ و ایمان کے آگے لاچار تھا۔ مارشل لا کے گرم بگولوں سے عوام الناس کو نجات دلانا اور ان کے سروں پہ جمہوریت کے گہرے بادلوں کا ٹھنڈا سایہ بچھانا تو اس شخص کی ڈیوٹی تھی۔ میر صاحب کی بڑائی یہ تھی کہ اس نے اپنی دنیاوی سفر کے آخری پڑاؤ تک اپنا یہ فریضہ ایک اچھے سپاہی کی طرح انجام دیا جس کی گواہی ہر قلی کیمپ، ہر پاکستانی جیل اور اِن جیلوں کا ہر ہر کمرہ، بلوچستان کے شہروں کی ہر گلی، مکران و خضدار کی ہر سبک رفتار مُہری اور سیاست کا ہر شاگرد دے گا۔

ایوب خان کے ون یونٹ کے بعد جنرل ضیا کا زمانہ بھی جمہوریت پسند سیاست دانوں کے لیے نہایت کٹھن وقت تھا۔ قائدین کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑ رہا تھا لیکن ایسے سخت ترین حالات میں بھی میر غوث بخش بزنجو اپنے ترقی پسند دوستوں کے ساتھ آمریت کا مقابلہ کرتا رہا۔

پھر جب ضیا نے بھٹو پہ مقدمہ بنایا اور کیس چلایا تو سندھ ہائی کورٹ میں نومبر 1977ء میں ایک بیان میں بزنجو صاحب نے کہا تھا، ''آج آپ نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں ایک شخص پر مقدمہ چلا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر محاسبہ ہو رہا ہے لیکن بلوچستان میں اگر میرے سیکڑوں آدمی مارے جائیں، بلوچستان میں فوجی کارروائی پر روزانہ ایک کروڑ روپے خرچ کیے جائیں، دو منتخب حکومتوں کو توڑ کر وہاں کے عوام کو اُن کے حقوق سے محروم کیا جائے، انھیں

احساسِ محرومی میں مبتلا کیا جائے اور اگر ان تمام واقعات میں ملوث افراد کا محاسبہ نہ ہو تو پھر مجھے اس محاسبے سے کیا حاصل ہوا، جو اس وقت ملک میں ہو رہا ہے''۔

مگر چانسلر بزنجو اُس بھٹو کی پھانسی پہ شاید سب سے زیادہ ملول ہوا، جس بھٹو نے اُس کی قومی نسل کُشی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا، اور بھٹو کا صرف یہ قصور نہ تھا، اُس نے تو معاشرے کے آگے کی طرف سرکنے والے بازو ہی توڑ ڈالے تھے۔ اس نے سرمایہ کاری روک دی اور بوسیدہ' دم توڑتے ہوئے جاگیرداری نظام کو مستحکم کیا۔ اس کے دور میں کوئی قابلِ ذکر صنعتی ترقی نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس صنعتوں کی تباہی کا بندوبست کیا گیا۔ بے شمار کارخانے اور فیکٹریاں بند ہو گئیں اور مزدور بڑے پیمانے پر بے روزگار ہو گئے۔ عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے پاکستان کے سرمایہ داروں نے اپنا سرمایہ بیرونی ممالک میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ پیداوار گھٹ گئی، مہنگائی بڑھ گئی اور ملک کی معیشت کو شدید نقصان پہنچا۔ بھٹو حکومت نے جاگیرداروں کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہنچائے اور انھیں لوٹ مار کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی۔ کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ اس میں بڑے پیمانے پر صنعتیں موجود نہ ہوں۔ صنعت کاری، معیشت کی جان ہوتی ہے۔ بھٹو نے صنعت کاری کے عمل کو دانستہ طور پر روکا اور اس ملک کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ اس نے نیشنلائزیشن بھی اس انداز سے کی جس کا نتیجہ سرمایہ داری کا فروغ نہیں نکلا بلکہ الٹا جاگیرداری مستحکم ہو گئی۔

مگر ان تمام جرائم کے باوجود ایک سیاست دان کو پھانسی دینے پر میر غوث بخش بزنجو بہت غمگین ہوا۔ ایسے تھے ہمارے رہبر، ایسے تھے ہمارے لیڈر، اور بعد میں اسی فاشسٹ پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر اس نے ایم آر ڈی میں کام کیا۔ کوئی گلہ شکوہ نہیں، کوئی طعنہ نہیں۔

ضیاالحق کو بزنجو کی سیاست اور عوام الناس کی تحریک تقریباً تقریباً مار چکی تھی کہ شیطان نے اسے پھر بچا لیا۔ شیطان تو بقول خمینی، امریکہ ہے ناں!!۔ اسی زمانے میں پڑوسی افغانستان میں دلچسپ واقعات ہو رہے تھے۔ وہاں بادشاہ ظاہر شاہ کے وزیراعظم داؤد نے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا اور خود کو افغانستان کا صدر، اعلیٰ حضرت، اور وزیراعظم بنا دیا۔ یوں ایک خستہ، اور غیر جانب دار

بفرسٹیٹ اچانک دونوں سپر پاوروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ سوویت یونین کی سرحد پہ واقع اس ملک کو داؤد کے آنے کے بعد خطے میں سب سے بڑے امریکی اتحادی پاکستان کی' سوشلزم دشمن ترغیبات کا سامنا تھا۔ امریکہ' پاکستان اور بادشاہی ایران ہر وقت تاڑ میں رہتے تھے کہ سامراجی اثرات افغانستان میں پھیل جائیں اور سوویت یونین کا انقلاب تخریب ہو۔ داؤد کی صورت میں انھوں نے یہ کام کرڈالا۔

شاہ ایران اور سعودی شاہ نے اسے پیسہ دیا' اور پھر' پاکستان کا دورہ کر کے اس نے دوسری امداد کو حتمی بنا کر امریکی مہرے کے بطور کام کرنے کی ٹھان لی۔ پورے خطے میں ایک تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

مگر اسی دوران 1978ء میں محنت کش نظریے والی سیاسی پارٹی کی قیادت میں افغان انقلاب برپا ہوا۔ داؤد گیا اور مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی پورے علاقے میں۔ دنیا بھر کے اچھے انسانوں کی طرح بزنجو صاحب نے بھی بھرپور انداز میں اس انقلاب کی حمایت کی۔ پورا خطہ تبدیلیوں کی لپیٹ میں تھا۔ افغانستان کی مثبت کروٹ کے ساتھ ساتھ ایران میں بھی بادشاہی نظام کا خاتمہ ہوا۔ اور پے در پے بہت ہی حساس اور دیرپا تبدیلیاں ہوتی رہیں............اور بزنجو بابا مستقل مزاجی سے ترہ کئی، امین، ببرک اور نجیب کے انقلاب کا زبردست حامی اور دفاع کنندہ رہا۔ ضیا کا پورا بقیہ دور ہم سب نے ایک ہی کام میں گزارا............افغان انقلاب کی حمایت۔ ہمیں اپنا انقلاب بھی بھول گیا، اپنی جمہوریت بھی ملتوی کہ کسی طرح یہ عوامی انقلاب بچ جائے۔

26

ایم آر ڈی

اسی دوران مختلف سیاسی پارٹیوں نے مل کر موومنٹ فار ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی (تحریک بحالئ جمہوریت) نامی متحدہ محاذ بنایا۔ مگر میر غوث بخش نے ایم آر ڈی نامی اس متحدہ محاذ میں شامل ہونے میں جلد بازی نہ دکھائی۔

1981ء میں بننے والے اس اتحاد میں جمہوریت کی ریسٹوریشن کا مطلوب محض ضیاالحق کا نکالنا قرار دیا گیا تھا۔ (اُس کے بعد بھی بننے والے تمام اتحادوں کا مقصد صرف اقتدار پر براجماں شخص کی تبدیلی کا رہا۔ گویا ہمیشہ یک نکاتی ایجنڈہ پر مشتمل سیاسی اتحاد بنتے رہے)۔ جب کہ بزنجو صاحب کا اصرار تھا کہ ضیا کے نکالنے اور جمہوریت کی بحالی میں بہت فرق ہے۔ پوری فوج کو بحیثیت ادارہ سیاست سے نکال باہر کرنے سے ہی جمہوریت ممکن ہوگی۔ میر صاحب کے ایم آر ڈی میں فوری نہ کودنے کی دوسری وجہ اس اتحاد کا پاکستان میں بسنے والی قوموں کی خودمختاری سے متعلق پس وپیش کرنا تھا۔ بابا کا اصرار تھا کہ 1940 کی لاہور قرارداد کے مطابق قوموں کے اختیار والے حصے کو پروگرام کا حصہ بنایا جائے۔

اس نے ان دو نکات کے شامل کرنے سے قبل کسی بھی مارشل لامخالف جدوجہد' میں تو ایم آرڈی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا مگر اس میں شامل ہونے سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ اس محاذ کے بننے کے دوسال بعد اگست 1983ء میں ایم آرڈی کی شروع کردہ تحریک میں بزنجو صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خود گرفتار ہوا۔ پارٹی ورکر جیلوں میں پھینک دیے گئے اور یہیں جدوجہد کے دوران وہ ایم آرڈی میں شامل ہوگیا۔

ایم آرڈی نے قوموں سے متعلق ''چار محکمے مرکز کے اور باقی صوبوں کے''، والا فارمولا تسلیم کیا۔

27

بزنجو کی سیاست کے خدوخال

میر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بظاہر ایک غیر سیاسی سماج میں سیاست کرتا تھا۔ اور سیاست بھی عوامی کرتا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ دنیا میں عوامی سیاست سے بڑھ کر کوئی اور بڑی نیکی ہو ہی نہیں سکتی۔

بزنجو کی سیاست عوامی رہی اس لیے کہ وہ عوام میں بہت جلد گھل مل جاتا تھا۔ اُس کے اندر یہ ایک قدر کی صلاحیت کے بطور موجود تھی کہ بزنجو کے ساتھ کمیونی کیشن میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا تھا۔ وہ عام عوام سے، ناخواندہ سے، تعلیم یافتہ سے، بوڑھے، جوان، مفلس، دولت مند، سیاسی، غیر سیاسی .... الغرض ہر شخص کے ساتھ اُس کی سطح پہ جا کر آسانی کے ساتھ گفتگو کرتا اور اپنا نقطۂ نظر سمجھاتا۔ یہ صلاحیت بہت کم لیڈروں میں پائی جاتی ہے۔

اور اُس کی سیاست کبھی خودغرضانہ نہ رہی۔ وہ سیاست برائے سیاست کبھی نہیں کرتا تھا۔

عبداللہ جان جمالدینی جب اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کر کے محکمہ جنگلات میں اسسٹنٹ کی نوکری کرتا تھا تو ایک دوست نے اس سے کہا، ''بڑے افسوس کی بات ہے۔ اتنی تعلیم کے بعد کلرکی

کررہے ہو۔چھوڑ دوملازمت اورقومی تحریک میں شامل ہوجاؤ''۔ بزنجوصاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا،'' بھائی لوگوں کوکیوں بے روزگار کرتے ہو۔ روزگار اور ملازمت کر کے بھی لوگوں کی خدمت کی جاسکتی ہے''۔(35)

اورکتنی حوصلہ افزائی کرتا تھا وہ سیاسی کارکن کی! ۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہمارے ایک بلوچ سیاسی کارکن نے تیز وطرار قوم پرستوں کی جانب سے خود پہ طرح طرح کے الزامات کی شکایت کی تو بابا بہ یک وقت نسوار اور تھری فائیوسگریٹ کے مزے لیتے ہوئے بولا تھا،''ابّا، تو جوانئے کہ پنجابیانی ایجنٹ بوتگئے ، مناں تہ 'پنجابیانی ایجنٹا' اوارا ایرانئے پلیتیں بادشاہئے ایجنٹ ہم گوئشتیش ، منی نام گوں زہرا ''غوثو'' ایرکثیش ، اومئے جوائیں شاعر گل خانا را 'گل خاتون' گشنت''۔

سیاست تو غوث بخش کی تقدیس تھی، ایقان تھی، اس کا جیون بیلی تھی۔ ساری سیاسی معاشی معاشرتی برائیوں اور بے بسی کا حل ہی سیاسی عمل میں کود جانا ہے۔ سیاست نہ کر کے، اور سیاسی عمل جاری نہ رکھنے سے قبائلی فرسودہ اقدار کی بالادستی میں معاونت ہوتی ہے۔ سیمینار، مباحثے، پریس کانفرنسیں، اجتماعات اور تنظیم کاری کر کے ہی عصر کے تقاضوں کی ہم سری ممکن ہے۔ گوکہ سیاست آج کے تناظر میں ہمارے ہاں بہت سہل' بہت نقد آور، توانائی بخش اور بہت بے اصول مشغلہ بن گیا ہے مگر بزنجو صاحب کے دور میں سیاست سے ملاقات کا شرف صرف قلی کیمپ کی اذیت گاہ میں ہوا کرتا تھا۔ اسی پری پیکر کا دل لبھانے میں تو بزنجو صاحب کی ساری جوانی بیت گئی۔ اس کے سارے شوق، ساری سہولتیں، اور سارے ارمان اسی سیاست کی دہلیز پہ قربان ہوئے۔ اس کے سارے رویے، اسی سیاست کی دُھن میں ڈھل گئے تھے۔ اسی سیاست کے لیے تو وہ قلی کیمپ، حیدرآباد اور نہ معلوم کن کن غیر آباد عقوبت خانوں کو آباد کرتا چلا گیا۔

میر غوث بخش بزنجو 1938ء سے لے کر اپنی موت تک پوری نصف صدی تقریباً تقریباً ہول ٹائم سیاست کرتا رہا۔

ہمارا بابائے بلوچستان اپنے اصولوں پر بہت پختہ تھا۔ وہ اپنے نظریات میں دھونس، دھاندلی، روپیہ پیسہ پر توجہ تک نہیں دیتا تھا۔ بزنجو تو بابائے اصول تھا، بابائے قول تھا۔ اس نے جب

ایک بار کوئی فیصلہ کرلیا، ایک رائے قائم کرلی تو پھر اسے کوئی بھی چمک لبھا نہ سکی۔ کتنی بار اسے خریدنے کی کوشش کی گئی ہوگی، کتنی بار اسے دھمکیاں دی گئی ہوں گی' کتنی لاٹھیاں اس کی نازک پشت پر برسائی گئی ہوں گی' اس کے کتنے سیاسی رفیقوں، سیاسی بچوں کو پھانسی چڑھایا گیا ہوگا۔ مگر وہ اپنے اصولوں پر آخر تک قائم رہا۔

ہم اگر، عادی بنائی گئی شخصیت پرستی، سے باہر نکلیں تو ایک بات کا اندازہ ضرور ہوگا کہ بلوچستان میں بزنجو صاحب کا قافلہ صرف اور صرف اپنی سیاست کی وجہ سے بلند مرتبت بنا۔ سیاست ہٹا دو تو اِن لوگوں میں اور کچھ بھی نہ بچے۔ ان کی ساری ملنساری، منکسرالمزاجی، بہادری، اور مستقل مزاجی اسی سیاسی پراسیس ہی کے طفیل تو تھی۔

اور سیاست ایک ایسی چیز ہے جو نظریات کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ گوکہ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان کے بورژوا سیاستدانوں میں ''اقتدار ہی نظریہ'' رہا ہے مگر ہم اُس سیاست کی بات نہیں کر رہے جس سے کہ انسان ہلکا بن جاتا ہے۔ ہم تو بھاری شخصیات کی بات کر رہے ہیں اور اُن کے نظریات کی بات کر رہے ہیں............اور سچی بات یہ ہے کہ اگر کسی نے بزنجو صاحب کی بڑائی کا اندازہ کرنا ہو تو اُس کے نظریات دیکھے۔ بزنجو واضح نظریات رکھتا تھا۔ اس کی سیاست بلکہ اُس کے ذاتی اعمال اور رویے اس لیے ممتاز اور بلند تھے کہ اُس کے نظریات اعلیٰ تھے، افکار ممتاز تھے۔

ہم اپنے آپ کو بھی' اور اپنے قاری کو بھی کسی گہری سوچ میں ڈالے بغیر بڑے یقین کے ساتھ بزنجو صاحب کی سیاست کے بارے میں دو باتیں کہیں گے؛

اول: اسے جمہوریت پر ایمان تھا۔ اس نے اپنے اس یقین کو کبھی متزلزل نہیں ہونے دیا۔

دوم: گفت وشنید۔ اول الذکر بات منزل تھی اور ثانی الذکر اس کے حصول کی حکمتِ عملی۔

اس کی سیاست کے بڑے بڑے نکات یہ تھے:

27.1
بلوچ دوستی

بزنجو صاحب سب کچھ بعد میں تھا، اول وہ بلوچ تھا۔ وہ بلوچ اور بلوچیت پر کوئی مصلحت مصالحت نہیں کرتا تھا۔ ہم کچھ مثالیں دیتے ہوئے آگے بڑھیں گے؛

''بلوچ، اور پٹھان، پاکستان افغانستان اور ایران میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے جب ان کا سوال اٹھے گا تو میں ضرور بات کروں گا۔ اور تینوں ملکوں کے درمیان حائل سرحدی لکیریں مجھے ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے سے نہیں روک سکتیں''۔(36)

رحمت شاہ سائل نے نیپ حکومت توڑ دینے کے بعد پشاور میں شہدائے بابڑہ کے جلسے کا ذکر لکھا جہاں بزنجو، اور باچا خان موجود تھے۔ بلوچستان میں نیپ حکومت ختم کرنے کے خلاف عوامی جدوجہد جاری تھی۔ چنانچہ اس ماحول میں حبیب جالب کی نظم ''بلوچستان جلتا ہے تو پاکستان جلتا ہے'' کی کیفیت ہی چھائی ہوئی تھی۔ اس جلسے میں تقریریں شروع اور ختم اِس نعرے پر ہوتی تھیں ''مظلوم بلوچستان............زندہ باد''۔ یہ نعرہ گویا دوسرے تمام نعروں پر حاوی تھا............

جس وقت بزنجو صاحب تقریر کرنے آیا تو جوش وجذبہ دیدنی تھا۔ کوئی اپنی چادر لہراتا، کوئی اپنی ٹوپی لہراتا اور ''مظلوم بلوچستان، مظلوم بلوچستان'' کے نعروں نے بابڑہ کو سر پہ اٹھا لیا تھا۔ لگتا تھا آپ بلوچستان آ چکے ہوں............ بزنجو نے جو پہلی بات کی وہ یہ تھی............

''میں یہاں دونوں قوموں (بلوچوں پشتونوں) کو گواہ بنانا چاہتا ہوں، کس بات پر؟ آپ دونوں اقوام نوٹ کرلیں۔ آپ لوگ ناراض نہ ہوں مگر بلوچستان تو مظلوم نہیں''۔

لوگوں کے تو پیروں تلے زمین نکل گئی۔ لوگ حیران ہوئے۔ بزنجو صاحب نے یوں وضاحت کی؛

''اے لوگو! اے پشتونو! مظلوم اُس کو کہتے ہیں جو اپنا حق نہ پہچانتا ہو اور نہ حق لینا جانتا ہو۔ تم گواہ رہنا اور یاد رکھنا کہ ہم نہ صرف یہ کہ اپنا حق پہچانتے ہیں بلکہ اپنا حق لینے کا طریقہ بھی

جانتے ہیں۔ اس لیے معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ ہمیں مظلوم نہ کہیے''۔

تب جلسہ سے یہ صدائیں بلند ہوئیں............''زر بلوچستان، زر بلوچستان''۔(37)

27.2
سامراج دشمنی

انگریز، بابا کا اولین دشمن تھا جس نے ولایت سے آکر ہمارے وطن پہ بزور قبضہ کیا تھا۔ اور یہ زور صرف ہاتھوں ہتھیاروں کا نہ تھا بلکہ انگریز بہت سی تدابیر وسازشوں کا بھی استاد تھا۔ اس نے بندوق چلانے کی جگہ بندوق چلائی، تھپڑ مارنے کی جگہ تھپڑ ماری، چاپلوسی کی جگہ چاپلوسی کی، رشوت دینے کی جگہ پیسہ لٹایا، اور سازش کی جگہ سازش کی۔

انگریز سامراج نے ہمارے سماج کی داخلی ساخت پہ بہت اثر ڈالا۔ اس نے ہمارے سرداروں خانوں کی سرداری اُس وقت بچالی جب وہ خطرے میں تھیں۔ سنڈیمن پہلے اسی بہانے ڈیرہ غازی خان سے لے کر قلات تک گیا۔ اس کا دوسرا سفر بھی اسی 'نیک' کام کے سلسلے میں تھا۔ سرداروں کے خلاف بغاوت کی ہر طرح کی چنگاری اسی شخص نے مصالحت کرا کے بجھا دی۔ خان قلات کا اپنا پانسہ بھی زوال کی طرف جا رہا تھا اور وہ ''بوڑھا دانت'' زور زور سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ لیکن ''خیر خواہ'' سنڈیمن نے سارے سرداروں کی خان سے مصالحت کروا کر سرداری نظام کی اس بدصورت علامت اور قدیم چوکیدار کو از سرِ نو تخت پر بٹھا لیا۔

انگریز نے دوسرا کام یہ کیا کہ سرداروں کو لیویز کی نوکری، تاوان، وظیفہ، خان بہادری اور دیگر ایسی رشوتیں دے کر انھیں پیسوں سے خرید لیا۔ ان زرخریداروں نے بعد میں اپنے مالک کی ہر جگہ پر نمک حلالی دکھائی۔ اور اسی پیسہ سے اپنے اثر اور رسوخ میں اضافہ کیا۔

انگریز کی کوے جیسی چالاکی، سرداروں کی غداری اور عوام کی بے خبری جب باہم مل گئیں تو سامراج (اور فیوڈلزم) کی جڑیں سات زمین تک نیچے چلی گئیں۔ سامراج دشمنی کے ہر جذبہ اور آزادی کے ہر یاقوتی خیال کی راہ روک دی گئی۔ اسی پس منظر میں گل زمین میں سے ایک دونو جوان

نہ صرف اُگ رہے تھے کہ بلکہ صبحِ صادق کی طرح روشن سے روشن تر ہوتے جا رہے تھے اور آہستہ آہستہ اپنی منزل اور مراد کی راہوں پہ رواں ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک میر غوث بخش بزنجو تھا۔ بزنجو شکست خوردہ شخص نہ تھا بلکہ تیز رفتار، دور بین، پشیمان نہ ہونے والا اور بہت محنتی شخص تھا۔

انگریز کے جانے کے بعد بھی پتہ چلا کہ بزنجو نے انگریز کے خلاف کی گئی اپنی جدوجہد سے لیے ہوئے اسباق خوب اچھی طرح یاد رکھے تھے۔ جن میں سرِفہرست تو یہ بات تھی کہ انگریز کی طرح کے ہر بیرونی جارح کو اپنا دشمن ہی کہنا ہے۔ چنانچہ فرنگی کی ترقی یافتہ شکل یعنی امریکی سامراج کو بزنجو صاحب نے ہمیشہ اپنا سیاسی دشمن گنا۔ اور اپنی موت تک سامراج دشمنی میر صاحب کی سیاست کا جدا نہ کیا جا سکنے والا لازمی جزو رہا۔

بزنجو صاحب مستقل طور پر سیٹو اور سنٹو کی زبردست مخالفت کرتا رہا۔ وہ ایک غیر جانب دار ملک چاہتا تھا جس کا امریکی دفاعی معاہدوں سے کوئی تعلق نہ ہو اور جس کے تمام ممالک' بالخصوص پڑوسی ممالک سے دوستانہ تعلقات ہوں۔

بزنجو سامراجی قرضوں کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ امریکی قرضوں کو ضبط کرنا چاہتا تھا۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف میر صاحب کے نزدیک وہ ''بنیا'' ادارے ہیں کہ سود در سود والے قرض دیتے دیتے بالآخر مقروض کے گھر کا سامان' پگڑی، لباس اور عزت سب کچھ نیلام کر کے اسے عملاً اپنا غلام بناتے ہیں۔

بزنجو کو اپنی ساری سامراج دشمنی پر ناز تھا۔ اس نے تو فخر سے کہا تھا...... ''یہ جو جرنل صاحبان پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداریاں جتلاتے ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب ہم انگریز کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہے تھے، تو تم کس کیمپ میں تھے۔ کیا جنرل ضیاالحق اس وقت کوئی کیپٹن یا میجر نہیں تھا؟ اب کیسے اچانک آپ پاکستان کے ہیرو بن گئے............(38)

27.3

بین الاقوامیت پسندی

بزنجو صاحب محض سامراج دشمن نہ تھا' وہ تو دنیا میں امن کیمپ کا بہت بڑا دوست تھا۔

امن کیمپ، جس کی قیادت سوویت یونین کر رہا تھا۔ اس نے کبھی بھی یہ موقع پرستی نہ دکھائی کہ سوشلسٹ کیمپ کے ساتھ اپنی ہمدردی چھپائی ہو۔ میر غوث بخش بزنجو سختی سے ایک ناوابستہ خارجہ پالیسی کا قیام چاہتا تھا۔ وہ تمام فوجی معاہدے اور ملک دشمن سمجھوتے منسوخ کروانا چاہتا تھا۔ بزنجو صاحب سوشلسٹ ملکوں کے علاوہ دنیا کے تمام امن پسند، ترقی پذیر اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ برابری کی بنیاد پر دوستانہ سیاسی، معاشی اور تہذیبی تعلقات چاہتا تھا۔ اس نے بین الاقوامی سطح پر ہمیشہ ترکِ اسلحہ کی وکالت کی۔ وہ سامراج کے مفاد میں پاکستان کی سرزمین کے استعمال کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھا۔ میر غوث بخش بزنجو فلسطین، ویت نام اور کیوبا کی سامراج دشمنی کی اعلانیہ حمایت کرتا تھا۔ وہ نوخیز آزاد ممالک کے اندر امریکی سامراج کی مداخلت کو بہت حقیر گردانتا تھا۔ بابا نے بہت محنت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ بلوچوں کو افروایشیائی تنظیم میں شامل کیا، غیر جانب دار تحریک سے جوڑ دیا، اور بین الاقوامی امن تحریک کے ساتھ پیوست کیا۔ اس نے بلوچوں کی سیاسی پارٹی کے توسط سے کمیونسٹ انٹرنیشنل، عالمی یوتھ موومنٹ، انٹرنیشنل یونین آف سٹوڈنٹس میں اس قوم کی نشست ریزرو کروادی۔

میر صاحب میں یہ جرأت تھی کہ وہ قومی حقوق کی سیاست کے لبادے میں چھپے ہر اُس رجحان سے اعلانیہ مخالفت کا اظہار کرے جو نسلی تعصب پر مبنی ہو۔ نسل پرستی، ہر گھڑی سیکڑوں خانوادوں کو تباہ کرتی چلی جاتی ہے۔ ممالک کی شکست وریخت تو شاید غیر فطری سرحدوں کے ڈھے جانے کی فکری بحث میں فٹ آ جائے گی مگر نسل کے نام پر، اور زبان و رنگت کے نام پر بستیاں اجاڑنا، گھر جلا ڈالنا اور حتیٰ کہ کائنات کی سب سے خوب صورت چیز یعنی انسان کا گلا کاٹنا صریحاً نسل پرستی ہے۔ تعصب کی یہ مکروہ صورت ہمارے سماج میں آج بھی اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ موجود ہے۔

میر صاحب اپنی بلوچ دوستی میں بہت واضح تھا۔ وہ قطعاً ایک عام سا شاؤنسٹ نہ تھا جس کی ابتدا بھی بلوچ ہوتی اور انتہا بھی۔ وہ ہم سب بلوچوں کے لیے مثال تھا۔ اس نے کہا تھا، ''میں صرف بلوچوں کی بات نہیں کرتا، بلکہ تمام دنیا کی مظلوم اقوام کی بات کروں گا، خواہ وہ کہیں بھی آباد ہوں۔ ہم اس کرہ ارض کو کسی کی جاگیر میراث نہیں سمجھتے''۔ (39)

ہندوستان کے ممتاز صحافی راجندر سرین کو اپنے ایک انٹرویو میں اس نے کہا تھا،" میں وحدتِ انسانی پر، بنی نوعِ انسان کے ایک ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔ موجودہ فاصلے اور دوریاں کتنی ہی کیوں نہ ہوں، اس دنیا کو ایک واحد گھرانہ بنانا ہے۔ ہمیں اس گھرانے کی بنیادیں رکھنے کا فریضہ انجام دینا ہے"۔(40)

27.4

شہنشاہیت مخالفت

میر غوث بخش بزنجو بادشاہی نظام کا سخت مخالف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بادشاہی نظام بہت طریقوں سے سرداری نظام کے ساتھ ہم رنگ ہے۔ یہ دونوں نظام دو باتوں پہ زندہ رہتے ہیں؛ ایک مذہب سے کھیلنا اور دوسرا' ظالم و ناروا رواجوں کو زندہ رکھنا۔

میر صاحب نے کبھی بھی مذہب کو اپنی سیاست کے لیے استعمال نہ کیا۔ اسی طرح روشن فکر بزنجو نے بے رحم اور کم ذات رواجوں کے خاتمے کو اپنی سیاست کا ایک بڑا حصہ بنا دیا۔ میر صاحب نے بادشاہی نظام کے ختم ہونے کو اصل میں فیوڈل نظام کو دھچکا پہنچنا قرار دیا۔ جس وقت ایران اور افغانستان کے بہادر عوام نے اپنے ملکوں سے بادشاہوں کا تخت الٹ دیا تو میر صاحب بڑی عید کی طرح خوش ہوا تھا۔

مگر بزنجو کا سب سے بڑا کارنامہ شاید یہ تھا کہ اس نے سیاست کو ایوانوں سے نکال کر عوام الناس تک پہنچایا۔ وہ سیاست کا کتابچہ لیے بڑے لوگوں کے بجائے بدقسمتی کی گود میں پڑے چرواہے کی جھگی تک پہنچا، بے بسی کے جال میں لپٹے مچھیرے کو جگانے اُس کی کشتی میں کود پڑا، اسے اس کی ذلت بھری زندگی کا احساس دلاتا رہا اور اسے انسانی زندگی کی سب سے بلند سرگرمی یعنی سیاست میں لے کر آیا۔ میر' اپنی پوری زندگی سیاست کے اندر عوام الناس کو ساتھ لے کر چلا۔

ہم نے دیکھا کہ خوبیوں سے بھرا یہ شخص مکمل طور پر ایک سیاسی انسان تھا۔ سوتے جاگتے سیاسی انسان۔ وہ اندر باہر ظاہر باطن سیاست ہی سیاست تھا۔ اس کی روزمرہ مصروفیت ہی سیاست

تھی۔ وہ تاریخ جانتا تھا اس لیے کہ سیاست نے اسے ایسا کرنے کا کہا۔ وہ بلوچ موسیقی، شاعری، تہذیب اور ثقافت جانتا تھا، اس لیے کہ یہ سیاست کی ضرورت تھی۔ وہ مذاکرات کا بیٹا، بھائی اور باپ تھا، اس لیے کہ سیاست نے اسے ایسا ہونے کا کہا تھا۔ وہ خود رو لیڈر نہ تھا، نہ ہی 'پدرم صدرِ پارٹی بود' والا معاملہ تھا۔ وہ 50 برس کے ریاضت بھرے ارتقائی پراسیس کے بعد ایک بین الاقوامی سٹیٹس مین کے مقام تک پہنچا۔

27.5

سرقبیلوی نظام مخالفت

میر غوث بخش سمجھتا تھا کہ فیوڈل اور سرقبیلوی نظام بلوچستان کی ساری مصیبتوں کا سبب ہے۔ اور عوام کی ترقی کے لیے اس نظام کا خاتمہ ضروری ہے۔ مگر وہ سرقبیلوی کا بحیثیت نظام کے مخالف تھا' اس کا جھگڑا کسی ایک فرد سے نہ تھا۔ سرداری نظام کا پورا سیاسی سماجی کلچر میر صاحب کو اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کی جگہ پہ وہ ایک ترقی یافتہ عوامی کلچر رواج دینا چاہتا تھا۔ ایک منجھے ہوئے مدبر کی حیثیت سے وہ جانتا تھا کہ " قبائلی نظام کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ علاقے کے ذرائع پیداوار اور سماجی معاشی حالات کو بدل دیا جائے اور ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جو لوگوں کو اقتصادی طور پر پرانے قبائلی بندھنوں سے آزاد کرے..........."(41)

بزنجو صاحب قبائلی جھگڑوں کو بلوچ کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ قبائلی جنگیں سب سے بڑی غیر سیاسی جنگیں ہیں ....اور ایک سیاسی آدمی غیر سیاسی پن سے نفرت تو کرتا ہی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ آج بلوچ بدترین قبائلی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے بزنجو کے نظریات پھیلانے اور اس کی سوچ کو عوام الناس تک پہنچانے میں بہت سستی اور لاتعلقی دکھائی۔ بلوچستان کی خشک زمین اور کٹھن کوہستان کا یہ البیلا اس لیے خوش قسمت تھا کہ اسے شروع سے کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی استادی نصیب رہی۔ اس کی

برکت سے میر صاحب ساری زندگی اپنی مقرر کردہ راہ سے بھٹکا نہیں۔

27.6
ایک وفاقی نظام کے لیے

بزنجو، بلوچ کو ایک قوم سمجھتا تھا۔ ایک ایسی قوم جس کا عظیم الشان ماضی رہ چکا ہے، جس کی ایک تہذیب ہے، اپنی تمدن ہے، اپنے سیاسی ادارے ہیں، زبان ہے، جغرافیائی علاقہ ہے، عوامی عدالتی نظام ہے، ادب ہے۔ ایک یکساں نفسیاتی ساخت ہے۔ لہٰذا یہ جدید تقاضوں کے مطابق، ایک الگ قوم ہے۔

اور بزنجو اس قوم کا ترجمان رہا ساری زندگی۔ ایک بہت ہی مدلل، مستقل مزاج اور عملی بلوچ سیاست دان جس کے نظریہ کو صرف اور صرف عوامی عمل واشتراک کی قیادت حاصل رہی۔ وہ آسمانی اور ہوائی باتیں نہیں کرتا تھا۔ قوم اُس کے لیے ایک ذمہ داری کا نام بھی تھا۔ بلوچ کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ بقیہ انسانیت کے ساتھ بھی ایک خاص ذمہ داری رکھتے ہیں۔ اس کے اپنے الفاظ میں: ''ایک چیز واضح کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ ہم تعصب کی بنیاد پر کسی سے حقوق نہیں مانگتے۔ ہم تنگ دامن اور تنگ نظر قوم پرستی کے مخالف ہیں۔ ہم اس قوم پرستی کے قائل ہیں جو انسانی شرافت کے تابع ہوگی، جو جیو اور جینے دو کے اصول کی بنیاد پر ہے، تعصب کی بنیاد پر ہرگز نہیں''۔

1985ء میں پاکستان نیشنل پارٹی کے صوبائی کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے بزنجو نے کہا تھا، ''جمہوریت ہو، ترقی پسند ہوں یا سوشلزم ہو جب تک قوموں کے بنیادی حقوق کا فیصلہ نہیں ہوتا، وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ جب روس میں انقلاب آیا تو ابتدائی احکامات میں لینن نے قوموں کا حقِ خودارادیت کو تسلیم کیا۔ اس نے کیوں ایسا کیا؟ اس کی دو وجوہات ہیں؛ ایک یہ کہ روسی قوم کو چھوٹی قوموں کے خلاف زیادتی سے روکا جائے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس سے قومیتوں اور قوموں کا تعین ہوجاتا ہے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں اور وہ سوشلزم کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ آپ اس اصول کے قائل رہیں کہ پاکستان میں جتنی بھی قومیں آباد ہیں، ان کا برابر کا حق ہے۔ ہمارے

نوجوان یہ جان لیں کہ ملک بھر میں صرف ہمارا اتحاد ہی اس ملک میں قوموں کو ان کے حقوق اور شرافت عطا کرسکتا ہے۔ تنہا کوئی قومیت بھی اس منزل کو پا نہیں سکتی۔ اس کے لیے مجھے مارکس کا وہ تاریخی جملہ یاد آتا ہے جو اس نے انگلینڈ کے مزدوروں سے کہا تھا کہ، اگر آپ لوگ آئرلینڈ کی آزادی کے لیے نہیں لڑیں گے تو آپ اپنی ہی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کریں گے۔ اس لیے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر پنجاب کے عوام اپنے استحصالی طبقے اور فوجی و سول نوکر شاہی کو لگام نہیں ڈالیں گے تو یہ پنجاب کے لیے بھی اور دوسرے صوبوں اور قوموں کے لیے بھی بربادی اور تباہی کا باعث ہوگا''۔

اس کا تو یہاں تک ایمان تھا کہ ''جس نظام میں عوام حقِ خودارادیت سے محروم ہوں، وہ جمہوری نہیں کہلایا جاسکتا''۔

بزنجو صاحب قوموں کے حقِ خوداختیاری کا چیمپئن تھا۔ اُس کی پوری جدوجہد میں اس نکتے کو اہمیت حاصل رہی۔ بالخصوص ون یونٹ کے قیام کے بعد تو بزنجو اس ون یونٹ کو توڑنے، انتظامی علاقوں کی بجائے لسانی ثقافتی اور تاریخی طور پر ایک جیسے انسانوں کے لیے صوبے بنانے اور تین محکموں یعنی امورِ خارجہ، دفاع، مواصلات کے علاوہ تمام اختیارات صوبوں کو دلانے کی جدوجہد کرتا رہا۔

بزنجو صاحب بہت ہی وسیع پس منظر میں بلوچ محبّ وطن تھا۔ وہ قبائلی قوم پرستی کے بہت خلاف تھا۔ اس کی وفاداری پہلے بلوچستان کے ساتھ تھی پھر ملک وغیرہ کے ساتھ۔ لیکن اس کے نزدیک یہ ایک جمہوری مطالبہ تھا اور اسے سیاسی عمل ہی سے طے کیا جاسکتا تھا۔ وہ دنیا بھر کے عوام سے محبت کرتا تھا۔ اس کی سیاست ایک طرف مزدوروں کسانوں، چرواہوں اور شتربانوں کے لیے وقف تھی تو دوسری طرف قوموں کے حقِ خوداختیاری اور صوبوں کے اختیارات میں بے پناہ اضافے پر استوار تھی۔ ون یونٹ کے خلاف میر کی سبک رفتار اور مستقل مزاج جدوجہد کو صرف بدبخت لوگ ہی بھول سکتے ہیں اور نامراد ذہن والے ہی گھٹا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ میر غوث بخش کی محنت اور استواری تھی جس کے نتیجے میں پاکستان کی بڑی بورژوا سیاسی پارٹیوں نے بالآخر میر صاحب کا فارمولا قبول کر کے ایم آر ڈی کی آفیشل پالیسی کی حیثیت سے صوبوں کی

خودمختاری کی بات شامل کرلی تھی۔

نہ صرف یہ بلکہ میر غوث بخش بزنجو پاکستان کی ازسرِ نو جغرافیائی تنظیم و تقسیم چاہتا تھا۔یعنی پاکستان کی وحدتوں کو لسانی تاریخی اور تمدنی بنیادوں پر تقسیمِ نو۔'' اور اگر کسی وحدت کا کوئی تاریخی تمدنی اور لسانی گروہ یہ مطالبہ کرے کہ وہ موجودہ وحدت سے متصل مادر وحدت میں جانا چاہتا ہے تو اسے اس کا پورا حق حاصل ہے''۔ یہ گویا ڈیرہ غازی خان ، راجن پور اور سندھ کے بلوچ علاقوں کی بات تھی۔

بزنجو صاحب کسی بھی ایک زبان کو دوسری زبانوں کا ہیڈ ماسٹر بنانے کے حق میں نہ تھا۔ وہ پاکستان میں بسنے والی تمام اقوام کی زبانوں کو سرکاری اور قومی زبانیں قرار دیتا تھا۔وہ بنیادی تعلیم قومی مادری زبانوں میں دلانا چاہتا تھا۔

ایوبی بدترین آمریت میں میر غوث بخش بزنجو نے جس جرم کی پاداش میں اذیت خانوں کو شرف بخشا وہ یہ تھا کہ اس نے کرنسی نوٹ پر لکھا تھا؛'' ون یونٹ توڑ دو''۔ یہ دہرانا مناسب نہیں لگتا کہ اس نے یہ جرأت ایک سفاک ترین حاکم کے دور میں کی تھی ، جب صوبوں کے حقوق کی بات کرنا عوام تک میں روسی بھارتی ایجنٹ ہونے کی نشانی تھی۔ بزنجو بسترِ مرگ تک اپنی اس بات پہ قائم رہا کہ قوموں کو اُن کے پیدائشی اور فطری انسانی حقوق دیے جائیں۔ یہ حقوق معمولی بات سے شروع ہوکر غیر معمولی بات یعنی حقِ علیحدگی تک جاتے ہیں۔ بزنجو صاحب قوموں کے جس حقِ خودارادیت کی بات کرتا تھا ، وہ صرف اپنی قوم تک محدود نہ تھا بلکہ وہ دوسری قوموں کو بھی یہ حق دیتا تھا۔کوئی بھی قومیت اگر علیحدہ طور پر نسلی اور لسانی بنیادوں پر حقِ خودارادیت چاہتی ہے تو دوسری قومیت کو طیش میں آ کر وہ باتیں نہیں کرنی چاہیں جو باتیں خود اس کے اکابرین بالادست قوموں سے زندگی بھر سنتے سہتے چلے آئے۔قوموں کے حقوق کا اصول عالم گیر صداقت پر مشتمل ایک اصول ہے۔قومی سوال کا ایک دوسرا (اور خطرناک) پہلو بھی ہے۔اور وہ ہے؛نسلی تعصب اور نسل پرستی۔ بابا میں یہ جرأت تھی وہ قومی حقوق کی سیاست کے لبادے میں ہر اُس رجحان سے اعلانیہ مخالفت کا اظہار کرتا جو نسلی تعصب پر مبنی ہوتا۔

پاکستان میں قوموں سے متعلق سوال پر بزنجو صاحب کے مؤقف کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے؛'' پاکستان کو ڈھیلی فیڈریشن کے اصولوں پر استوار کیا جائے۔ چوں کہ پاکستان میں آباد قومیں اپنا تاریخی ورثہ،قومی شناخت اور تشخص رکھتی ہیں اور صدیوں سے اپنی سرزمین پر آباد ہیں،اس لیے وفاقیت کی اصل روح کے مطابق ان کو مکمل خودمختاری دی جائے اور ایک وفاقی اکائی کی فوقیت اور بالادستی کو ختم کر کے ہر وفاقی وحدت میں موجود وسائل کو اُن قوموں کی ملکیت تسلیم کیا جائے ۔اور ہر قوم کو یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی ثقافت کو فروغ دے سکے۔

قوموں کے حقِ خوداختیاری اور سوشلزم سٹریٹجی ہیں' اصل اہداف ہیں۔اُدھر تک پہنچنے کی تدابیر اور داؤ پیچ بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنے کہ اصل اہداف۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ یہ شخص اپنے اہداف پر کس قدر مصمم اور اٹل رہا ہے۔ اِسی طرح اب یہ بھی دیکھ لیجیے کہ وہ داؤ پیچ پر کس قدر راسخ تھا۔ وہ ایسی تدابیر پر یقین رکھتا تھا جو اُس زمان و مکان میں قابلِ حصول ہوتے۔ چنانچہ' ایک بار' بابا ملتان آیا۔ میں ڈیرہ غازی خان میں تھا۔ میرے دوست اللہ بخش بزدار (جو کہ ھفت دسمبر بلوچ موومنٹ نامی تنظیم چلاتا تھا،جس کا بی ایس او سہب سے اتحاد تھا) نے میر صاحب سے اتحاد کی خواہش کی۔ میں اُس کی خواہش لے کر میر صاحب سے ملنے ملتان ،قصور گردیزی کے گھر پہنچا۔شاید ان کی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ ان دنوں ہو رہی تھی۔ پی این پی کی پوری لیڈرشپ وہیں موجود تھی۔ بابا نے حسبِ معمول گلے لگاتے ہوئے میری گردن کا بوسہ لیا۔اس نے سیاسی اور دیگر موضوعات پر جب اپنی بات ختم کی تو میں نے اس سے بی ایس او سہب ، اللہ بخش کی تنظیم اور اپنی پارٹی کی بلوچستان شاخ کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی کی بات کی۔ بابا نے میرے ساتھ تو کسی بڑے اختلاف کا اظہار نہ کیا مگر سہب والوں کے بارے میں مجھ سے کہا،'' جاؤ، کوئی سفید کاغذ لاؤ، میں اس پر دستخط کرلوں گا۔ جو بھی ان لوگوں کی شرائط ہوں گی ، مجھے منظور ہیں۔مگر یہ بی ایس او والے آزادی کی جو بانگ دیتے ہیں ، اِس سے انھیں دست بردار ہونا ہوگا۔ میں سب کچھ سہہ لوں گا مگر یہ بات قطعاً تسلیم نہیں کروں گا''۔

میں حیران ، اور ہکا بکا رہ گیا۔ بزنجو اور ایسی بات !!۔ایک صدمہ سا لگا۔ بڑے بلوچ نے

یک دم میرے سکتے کو بھانپ لیا اور انتہائی مدلل اور منطقی انداز میں کہا،’’وقت سے پہلے ایسی بلند بانگ باتیں کرنے کا کیا فائدہ۔آپ کے پاس قوت ہے، نہ اتحاد ہے، نہ ہی تنظیم ہے۔آپ وہ باتیں کریں جو عوام کے آج کے مسائل سے متعلق ہوں۔لوگوں کو منظّم کریں،انھیں سیاست سکھائیں۔پھر جب آپ کے پاس قوت آجائے اور آپ سمجھیں کہ پاکستان کے ساتھ گزارہ بالکل نہیں ہوسکتا تو آپ بلا شبہ اسے لات مار کر الگ ہو جائیں۔ابھی سے خوامخواہ لفاظی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟‘‘۔

اس کے بقول،’’..........میں اُن میں سے نہیں ہوں جو انتہا پسندانہ مطالبات کرتے ہیں مگر لیکن ایک بات میں فاش اور واشگاف کہوں گا کہ میں اُن میں سے بھی نہیں جو قومیتوں کو غلام بنانے کی کوششوں کے سامنے سینہ سپر نہ ہوں‘‘۔(42)

اس سلسلے میں اس نے ایک اور جگہ تو بالکل کھل کے بات کہہ دی:’’میں پاکستان کے اندر رہ کر قومیتوں کے لیے سیاسی معاشی خودمختاری چاہتا ہوں اور اس کے لیے لڑ رہا ہوں اور جب میں دیکھوں گا کہ حکمرانوں نے طے کرلیا ہے کہ وہ عوام کو غلام ہی بنائے رکھیں گے اور ہمارے لوگوں میں بھی یہ احساس پیدا ہوا کہ حکمران ہمیں غلامی کے علاوہ کوئی اور حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر میں آخری لڑائی میں اپنے لوگوں کا ساتھ دوں گا‘‘۔

(دل کرتا ہے اُس کے یہ فقرے تین چار بار دُہرا کر لکھوں!!)۔

بزنجو مفروضوں پہ مبنی نہ تھا۔وہ اپنے فکر کو عمل میں ڈال کر پختہ کر کے اس پر چلتا تھا۔اور عمل کی بھٹی تو عوامی عمل ہوتی ہے۔اسے بہت گہرا یقین تھا کہ:’’بلوچ قوم نے اپنے حقوق لینے کا فیصلہ کرلیا۔جلد یا بدیر وہ اپنے حقوق حاصل کرلیں گے‘‘۔(43)

27.7
سیکولرازم کے لیے

میر غوث بخش بزنجو مذہب کو سیاست میں داخل کرنے کا سخت مخالف تھا۔وہ ہر شخص کے

لیے عقیدے کی آزادی چاہتا تھا۔اور کسی کو اپنا عقیدہ دوسروں پر مسلط کرنے سے سخت نفرت کرتا تھا۔وہ ریاست میں تمام شہریوں کو بلا امتیازِ رنگ ونسل، مذہب وذات،فرقہ وعقیدہ،جنس و پیشہ یکساں معاشی سیاسی اور سماجی حقوق کی ضمانت چاہتا تھا۔

بزنجو بابا کے بارے میں یہ بات مسلّم ہے کہ وہ تعصّبات سے بالاتر شخص تھا۔اس نے مذہبی تفرقہ بازی کی ہمیشہ کھل کر مزاحمت کی۔وہ ان لوگوں کی سیاست کا سب سے بڑا مخالف تھا جو دوسروں پہ اپنا عقیدہ ٹھونسنا چاہتے ہوں، دوسروں کے مذہبی مقدس شخصیات اور مقدس مقامات کی بے حرمتی اور لوگوں کی دل آزاری کرتے ہوں۔وہ مذہبی رواداری پہ مبنی ایک سماج چاہتا تھا۔اس سوچ کی نفی کی بے رحم جھلکیاں ہمیں کشمیر اور بوسنیا سے لے کر لبنان اور فلسطین تک نظر آتی ہیں۔بابری مسجد کا انہدام اور بعد میں بلوچستان کے ہندوؤں کے ساتھ کی گئی نا روائی اسی ذہنیت کی کارستانیاں ہیں۔ذکریوں کے خلاف سالانہ جہاد بھی اسی دینی تعصب کا مظہر ہے۔بزنجو، سیکولر تھا۔اور سیکولرازم اس کا فلسفۂ حیات تھا۔یعنی ایک غیر فرقہ وارانہ ریاست کا قیام۔ایسی ریاست جو اپنے شہری کی صرف شہری کی حیثیت سے شناخت اور خدمت کرے۔

27.8
عورتوں کے حقوق کے لیے

میر غوث بخش بزنجو عورتوں کی بے حالی، غلامی اور اُن کی غیر انسانی زندگی پہ بہت کڑھتا تھا۔وہ عورتوں کے بارے میں روایتی قبائلی سوچ کا حامی نہ تھا۔وہ عورت کی نجات اور برابری پرزور دیتا تھا۔وہ عورت کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیتا تھا۔سماج میں معاشی سیاسی اور سماجی میدان میں ان کی برابری چاہتا تھا۔عورتوں کے خلاف سارے تعصّبات اور امتیازی قوانین کی منسوخی کا ارادہ رکھتا تھا۔وہ ملازمت پیشہ خواتین کے لیے خصوصی قوانین بنانا چاہتا تھا۔اُن کے بچوں کے لیے سرکاری نرسریاں تشکیل دینا چاہتا تھا۔بزنجو صاحب بارہ برس سے کم عمر بچوں سے محنت کروانے کو جرم گردانتا تھا۔

27.9

پارلیمانی جمہوریت کے لیے

میر غوث بخش بزنجو کی جمہوریت پسندی کے بارے میں کچھ لکھنے کی مجھے اس لیے زیادہ ضرورت نہیں کہ وہ دنیا میں جانا ہی اپنی جمہوریت پسندی کی وجہ سے جاتا ہے۔ وہ جو بھٹو صاحب نے کہا تھا،''طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں''۔ یہ دراصل بھٹو صاحب کا 1970ء کا فقرہ نہیں ہے۔ یہ تو بزنجو کا 1961ء کا فقرہ ہے، جو اس نے اُس برس مئی کے مہینے میں عثمانی کے استقبالیہ میں تقریر کے دوران کہا تھا۔(44)

''جمہوریت کے بارے میں میرا اپنا ایک تصور ہے۔ میرے نزدیک جمہوریت صرف جلسہ وجلوس اور نعرہ بازی کا نام نہیں۔ بلکہ جمہوریت کو میں ایک طرزِ زیست، طرز فکر اور ایک پیغمبرانہ عمل سمجھتا ہوں۔ ایک جمہوریت پسند کو سب کے ساتھ جمہوری رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اپنے گھر میں، دوستوں سے اور اپنے ملازمین سے جمہوریت پرستانہ سلوک کرنا چاہیے۔ میں پاکستان کو ایک جمہوری ملک دیکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں کسی کا استحصال نہ ہو، زندگی کے تمام شعبوں میں عوام کا رہنمایانہ رول ہو اور عوام کو ہی بالادستی حاصل ہو''۔

''میرے نزدیک جمہوریت صرف ووٹ ڈالنے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو جمہوری عمل کا محض ایک حصہ ہے۔ جمہوریت دراصل ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایسی ذہنی کیفیت جو ہر قسم کے امتیازات اور استحصال سے پاک ہو، اجتماعی اور انفرادی نوعیت کے تمام تر استحصال اور ہر قسم کے جبر واستبداد سے پاک ہو''۔

بزنجو صاحب دو ایوانوں والی پارلیمنٹ کے حق میں تھا اور وہ دونوں ایوانوں میں محنت کش طبقات کی متناسب نمائندگی چاہتا تھا۔ وہ ہر انتخابی حلقے کو اپنے منتخب نمائندے پر عدم اعتماد کی صورت میں اسمبلی سے واپس بلا لینے کو آئین کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔

27.10

سوشلزم کے لیے

بزنجو کی سیاست کو جس نظریہ کے سانچے میں ڈھلنا تھا، اُسے کمیونسٹ نظریہ کہتے ہیں۔ (سوبھو گیان چندانی کے بقول بزنجو صاحب جب ہندوستان گیا تو اس نے کامریڈ نمودری پد سے پوچھا کہ ''تم کب کمیونسٹ بنے؟''۔ کامریڈ نے جواب دیا کہ ''1941ء میں''۔ تب بزنجو صاحب نے اُس سے کہا،''میں 1937ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوا'')۔

اس کمیونزم نے اسے وہ مہارت عطا کردی جو اس کی آئندہ کی درخشاں سیاست میں اُس کے بہت کام آئی۔ وہ ہر طرح کی صورت حال کا سائنسی جدلیاتی انداز میں تجزیہ کرنے کے قابل اور عادی بن گیا۔ چنانچہ وہ ہر معاملے کا اسباب وعلل کی روشنی میں تجزیہ کر کے اپنا مؤقف بناتا تھا۔

بزنجو نے جب بلوچستان آ کر سیاست شروع کی تو ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے شروع کی۔ قادر بخش نظامانی تو اُس کے کمیونسٹ بننے سے تین برس قبل 1934ء میں کمیونزم کی کشش کے ہاتھوں ماسکو ڈیڑھ برس کے لیے گیا اور واپس آ کر امین کھوسہ اور عنقا صاحب کے ساتھ 1937ء میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی بنا چکا تھا۔ بزنجو 1937ء میں ہندوستان میں کمیونسٹ بن کر بلوچستان آیا اور بنی ہوئی پارٹی کا ساتھی بن گیا۔

ایک آزاد، خوش حال، اور جمہوری ریاست کا قیام میر غوث بخش بزنجو کا مقصدِ حیات رہا۔ وہ ایسی انقلابی زرعی اصلاحات چاہتا تھا جن کے ذریعے جاگیرداری اور ماقبل جاگیرداری کی باقیات کو ختم کیا جاسکے۔ وہ اراضی کی ملکیت کی انتہائی حد مقرر کرنا چاہتا تھا۔ مشینی زراعت، اور کوآپریٹو کاشتکاری کو رواج دینے کے ساتھ ساتھ اُس کا پکا ایمان تھا کہ سابق والیانِ ریاست، سرداروں اور وڈیروں کے وظائف، اعزازات اور خصوصی مراعات منسوخ کرنے سے انقلابی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ وہ سول اور ملٹری سرکاری نوکروں میں زمین کی مفت الاٹمنٹ کا سلسلہ بند کرنا

چاہتا تھا اور ساری ایسی زمین ضبط کر کے مقامی بے زمین کسانوں میں مفت تقسیم کرنے کا داعی تھا۔

بابا بزنجو سمجھتا تھا کہ جدید نوآبادیاتی نظام سرمایہ دارانہ قوتوں کی پرورش تو کرتا ہے لیکن ان کو پوری طرح پھلنے پھولنے نہیں دیتا۔ یہ ایک کمزور سرمایہ دار طبقہ کو جنم دیتا ہے، جو لوگوں کے مسائل حل کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اِس طرح آزاد ملکوں میں سرمایہ داری کا ادھورا پھیلاؤ اور نابرابری سرمایہ دارانہ نظام کا ایک خاصہ ہے۔ پچھلے دور میں بنیادی صنعتوں، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو تو ریاستی قبضہ میں لے لیا گیا لیکن اس کے باوجود بڑی اجارہ دار سرمایہ داری کے ہاتھوں ہمارے عوام کا استحصال مختلف صورتوں میں اب بھی برقرار ہے اور بیرونی سرمائے کے منافعوں کی صورت میں سامراجی ملکوں کو ہماری قومی دولت کا نکاس بدستور جاری ہے۔ بلکہ ماضی قریب میں تو ریاستی قبضہ میں لی جانے والی صنعتوں کو بھی سابق مالکوں کو واپس دینے کی پالیسی پر عمل کیا گیا۔ اور سرمایہ داروں کو منافع کی کھلی چھوٹ دے دی گئی، جس کا مقصد ملک کو سرمایہ دارانہ ترقی کے راستے پر ڈالنا تھا۔ مگر حکمران طبقات اس امر سے ناواقف ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اس دور کے مسائل حل کرنے کے لیے نہ صرف نااہل ہے بلکہ عالمی طور پر خرچ ہو چکا ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں بچا۔ اسی لیے بابا یہ سمجھتا تھا کہ ملک کی صنعتی پالیسی کو ملک کے قومی جمہوری تقاضوں کے مطابق عوام کی مرضی اور مفاد کی بنیاد پر استوار کرنا چاہیے۔ ریاستی شعبے کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے بابا بزنجو کا خیال تھا کہ اسے رفتہ رفتہ ملک کی معیشت میں ایک فیصلہ کن حیثیت دی جائے۔ وہ بھاری اور بنیادی صنعتوں کے قیام پر پرائیویٹ کی بجائے پبلک سیکٹر کو لگانا چاہتا تھا۔ بابا بزنجو کی خواہش تھی کہ ملک کے مختلف علاقوں میں نئی صنعتیں قائم کی جائیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ان صنعتوں میں مقامی آبادی کو روزگار مہیا ہو۔ اس طرح علاقائی و نابرابری کا خاتمہ بھی ہوگا اور انتقالِ آبادی کا راستہ بند ہو سکے گا۔

میر غوث بخش بزنجو کا عزم تھا کہ اُس کا دور آئے گا تو بیرونی تجارت ریاستی شعبے میں لی جائے گی اور اس سلسلے میں وفاقی وحدتوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ مرکزی پالیسی کی مطابقت میں خود بیرونی تجارتی معاہدے کریں۔

27.11

منظّم عوامی پارٹی کی جستجو

میر غوث بخش بزنجو عوامی سیاست کرتا تھا۔ اسی لیے تو وہ اس قابل رہا کہ اس نے عوام کی تنظیم اور منظّم سیاست کی راہ اپنائے رکھی۔ میر صاحب نے لاؤڈ سپیکر کو اپنا ہتھیار بنایا۔ پریس کانفرنس، دورے، لیکچر، الغرض عوام کے اندر رہ کر عوام کی سیاست جاری رکھی۔ اُس نے انا پرستی، اکڑی گردن اور چنگھاڑ والی سیاست دھتکار لی۔ وہ خود بھی ہیرو نہ بنا اور دیگر ''ہیرو'' بھی ہندو کے ہاں گائے کے گوشت کی طرح گردانے۔

وہ مہینے کے مہینے گھوڑوں اونٹوں پر سفر کر کے، اور کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر عوام کو سیاست میں شامل کرنے کی محنت کیا کرتا تھا۔ انھیں شعور دیتا، سیاسی بناتا اور سیاسی پارٹی میں شامل کرتا۔ بابا عام بلوچ کی سرفرازی چاہتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ عام بلوچ معزز نہیں ہوگا تو فیوڈل لوگ ہی سیاست پر مسلط رہیں گے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ''بلوچ معاشرے میں میری اختلافی سیاست اور اختلافِ رائے کو اس لیے برداشت کیا جارہا ہے کہ میرا تعلق سردار گھرانے سے ہے۔ یاد رکھو میرے بعد اختلافِ رائے رکھنے والوں کو اس قبائلی و روایتی معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی عام سیاسی ورکر کی اختلافی سیاسی دخل اندازی کو برداشت کیا جائے گا، حالاں کہ اختلافِ رائے رکھنا ہر انسان کا بنیادی و پیدائشی حق ہے''۔

ایک بار بروری روڈ پر، جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا، میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اس سے ملنے چلا گیا۔ (بزنجو صاحب کا کوئٹہ میں گھر نہ تھا، جی ہاں گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو کا کوئٹہ میں گھر نہ تھا)۔ میر صاحب اس دن مجھ پہ بہت برہم ہوا۔ اس لیے کہ میں نے تقریر کے سے انداز میں اپنے کمیونسٹ ہونے اور کسی بورژوا سیاسی پارٹی میں شامل نہ ہونے کا ''اعلان'' فرمادیا۔ اس نے آدھ گھنٹہ تک بات کی مگر اپنے کمیونسٹ ہونے کا کوئی دعویٰ نہ کیا۔ البتہ ایک ہی بات میں وہ ساری بات کہہ ڈالی جس پر ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے: ''تمھیں کمیونسٹ اسلم (سی آر اسلم) کو وہ

بے تکلفی سے اسلم کہتا تھا) نے نہیں بنایا، میں نے بنایا۔ میں نے تمھیں وہ سیاسی ماحول دیا جس میں تم آزادی سے سوچ سکنے کے قابل ہوئے، اپنی الگ اور خودمختار رائے بنانے اور رائے قائم رکھنے کے قابل ہوئے۔ میرے سیاسی کام کی تاریخ پڑھ کر دیکھو گے تو پھر انصاف سے کہہ سکو گے کہ تم اس ماحول کے تربیت یافتہ ہو جس کے ترتیب دینے میں میرا بہت بڑا ہاتھ ہے"۔

میں "پیریں مرد" کے بزرگانہ غصے اور دلائل کے سامنے کچھ بول بھی نہیں پا رہا تھا، مگر کمیونزم اور پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ اپنی وابستگی سے دست بردار ہونے کے لیے بھی تیار نہ تھا......بس' اللہ نے میری غیبی مدد کی اور اس کے ساتھ بیٹھے اس کی پارٹی کا ڈاکٹر عبدالحئی بول پڑا (جو بعد میں اس کا شدید ترین مخالف بنا)۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسٹائل میں مجھے اپنی (میر صاحب کی) پارٹی میں لے جانے کی کوشش کی۔ میں نے اچھی خاصی "برابری" والے انداز میں اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے کا اعلان کیا۔ مگر اس طرح کہ بابا کی تکریم پہ آنچ بھی نہ آئے اور ڈاکٹر صاحب سے دو بہ دو اپنی بات بھی کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی شریف انسان ہے، زیادہ نہ بولا مگر بابا نے اپنا لہجہ بدل کر صرف اتنا کہا کہ "بین الاقوامی سیاست میری اور اسلم کی ایک ہے، ملکی سیاست بھی ایک ہے، بلوچستان کی سیاست میں بھی جو میں کہتا ہوں اسلم بھی وہی کہتا ہے۔ مگر مجھے تم سے اختلاف یہ ہے کہ بلوچستان کی بات پر بھی تمھیں ساتھ لینے کے لیے مجھے اسلم سے بات کرنا ہو گی۔ یعنی تمہاری لگام اُس کے ہاتھ میں ہے۔ تم بے شک میری پارٹی میں نہ آؤ، مگر یہاں کی سیاست میں بلاشرط میرے ساتھ رہو"۔

میر صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اور اب میں اُس کی روح ہی سے پوچھ سکتا ہوں کہ بھلا ہم کب اُس سے جدا رہے؟۔ ہم نے تو اپنی پارٹی کے لوگوں سے زیادہ اُسے محترم رکھا۔ اُس کے بچوں سے زیادہ بچہ بنے رہے......اُس کے بچوں سے ہی پوچھ لیں!

خشکابہ کے اُس زمیندار کی سیاسی مصروفیات نے اسے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ وہ اپنی زمینداری پر، یا اپنے معاشی وسائل پر توجہ دے پاتا۔ اس لیے وہ ہمیشہ تنگ دست رہا لیکن اس نے کبھی بھی اپنی مالی کمزوری کا اظہار نہیں کیا اور صبر و برداشت کے ساتھ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کیا۔

اس کے عزیز و اقارب اور اس کے عقیدت منداُس کے سفر حضر کا درست انتظام کرتے تھے، گاڑی اور پٹرول کا خود بخود انتظام ہو جاتا تھا۔ اس لیے میر صاحب اپنی جیب کے خالی ہونے پر کبھی فکرمند اور پریشان نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اپنی سیاست کی پوری زندگی میں بلوچستان کے طول و عرض، اور گاؤں گاؤں کا دورہ کیا۔

وہ بہترین یادداشت رکھتا تھا۔ اس نے پچاس سال پہلے جن لوگوں کو دیکھا ہوتا یا جن کا مہمان رہا وہ سب اس کو یاد تھے۔ اور ان کے خاندانوں سے ہمیشہ اپنے تعلقات استوار رکھے۔ (44) اسی وجہ سے تو وہ آخر تک عوامی ہی رہا۔ جب عوام سے اس قدر آشنائی پیدا کریں گے تو پھر اُن عوام سے تو رشتہ پکا ہو جاتا ہے۔

میر غوث بخش بزنجو نے اپنی سیاسی زندگی میں کبھی ٹریڈ یونین پر توجہ نہ دی۔ اس نے کبھی کسان کمیٹیاں نہ بنائیں۔ طلبہ تنظیمیں اُس سے نہ بن سکیں۔ نیپ کے ٹوٹنے کے بعد میر صاحب کا بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن پر بھی تنظیمی طور پر کوئی خاص اثر نہ رہا۔ ایک عدد ڈی ایس ایف قائم کرنے کی کوشش کی، مگر وہ نہ بن سکی۔

مگر بزنجو طلبہ کو سیاست کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ پڑھائی اور سیاست میں توازن رکھتے ہوئے، بزنجو صاحب طلبہ کو سیاست کرنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔

27.12

بابائے مذاکرات

میر غوث بخش بزنجو شعوری طور پر القابات اور نام و نمائش سے دور بھاگتا تھا۔ اس کا ایک مشہور فقرہ تھا کہ "میں نہ شیر ہوں نہ قائد ہوں، میں انسان ہوں"۔ اچھے لوگوں کی اچھی باتیں ہوا کرتی تھیں...... "شیرِ پنجاب یا شیرِ بلوچستان اور پتہ نہیں کیا بلائیں ہیں۔ میں اُن میں سے نہیں ہوں۔ حضور، برائے خدا مجھے قائد جمہوریت وغیرہ نہ کہا کریں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ آپ لوگ مجھے بزنجو، غوث بخش یا ساتھی کہیں۔ ٹھیک ہے میں بزرگ ہوں، مگر کچھ اور نہیں"۔

یارلوگوں نے تو طنزاً اسے ’بابائے مذاکرات‘ کا خطاب دیا تھا۔لیکن وہی خطاب دراصل اس کے لیے اعزاز بن گیا۔اور ایک دنیا اس بات کی معترف ہوئی کہ سیاست میں مذاکرات نہایت ضروری ہوتے ہیں۔مذاکرات کے لیے ہمیشہ دروازے کھلے رکھنے چاہئیں۔سیاست تو گفتگو، بحث مباحثے، قائل کرنے قائل ہونے، لوگوں کو ہم خیال بنانے اور ہمیشہ اپنے مؤقف کی آبیاری کرتے رہنے کا نام ہے۔یہ درست ہے کہ مذاکرات کے لیے اہلیت وصلاحیت چاہیے۔اور بزنجو مذاکرات کے فن کا ماہر تھا۔وہ نہایت مشکل سیاسی حالات میں بھی اپنے تئیں انتہائی خلوص کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتا تھا۔ملک میں جتنے بھی سیاسی اتحاد بنے، ان میں بزنجو جیسے عالی وقار سیاست دان کی محنت شامل تھی۔1973ء کا آئین متفقہ طور پر آنا اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ہمارے اسی بابائے مذاکرات کو تو ’بابائے استمان اور بابائے بلوچستان بننا تھا۔مگر کیا کیا جائے یہی بات تو ہماری آج کی سیاست میں ناپید ہے اور اسی کی تو ضرورت ہے۔ہم اپنے آپ کو بار بار دہرانے سے بچنے کی خاطر اُس کی ایک تقریر کا ایک ہی اقتباس نقل کرتے ہیں۔جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا تھا؛

”............مگر ایک بات یاد رکھو! انتہا پسندی، مہم جوئی اور تشدد جیسے غیر سیاسی عمل سے آپ کوئی بڑا کام کبھی بھی سرانجام نہیں دے سکیں گے۔سیاست میں آپ کو تعمیری، مثبت اور جمہوری رویہ اختیار کرنا چاہیے۔صرف اور صرف جمہوری اصولوں پر عملدرآمد کرتے ہوئے ترقی پسند سیاست کو تقویت دی جاسکتی ہے“۔(45)

28

بزنجو کی لائبریری

ایک بار جب اُس سے ملنے اُس کے گاؤں نال گیا تو اس نے مجھے اپنی لائبریری دکھانے کی خواہش کی‘ جو کہ کتابوں سے بھری پڑی تھی۔لائبریری کی دیواروں پر ہوچی منہ اور گل خان نصیر کی بڑی بڑی تصویریں دیکھ کر جی خوش ہوا کہ پاؤں کی محتاجی سے پاک نظریات، دُور دنیا کے ایک کونے میں واقع یکسر مختلف تہذیب کے نمائندے کی تصویر کو‘ بلوچستان کے دور افتادہ کونے میں موجود واقعتاً الگ تہذیب کی لائبریری کی دیوار تک لے آئے جہاں کسی حسینۂ عالم، کسی شہنشاہِ بلوچستان کی کوئی تصویر نہ تھی......بس ویت نام کا ہوچی منہ تھا۔سلام ہو‘ ہوچی منہ پہ............اور سلام ہو‘ غوث بخش بزنجو پہ۔

لائبریری سے متصل کمرہ تھا جہاں بابا دن کا کھانا کھاتا، آرام کرتا اور لوگوں سے ملاقات کرتا۔وہ خود اس کمرے میں لیٹ گیا اور مجھے لائبریری دیکھنے کو کہا۔

میں نے گھنٹہ دو اپنے بابا کی لائبریری میں گزارے۔ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔صاف ستھری، سلیقہ سے رکھی کتابیں۔اردو انگریزی، فارسی، سندھی، بلوچی، روسی............مذہب‘

فلسفہ، ادب المختصر ایک خوب صورت ذخیرہ تھا نادر اور نایاب کتابوں کا۔ وہیں پر ''شاہنامہ فردوسی'' کا ایک نادر نسخہ رکھا ہوا تھا۔ یہ نسخہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے اپنے دستخط کے ساتھ میر غوث بخش بزنجو کو دورہِ ایران کے موقع پر تحفہ دیا تھا جب وہ گورنر کی حیثیت سے ایران گیا تھا۔

ملتان کے قریشی صاحب نے کتابوں کے اس انبار کی بہت خوب صورت کیٹلاگنگ کی ہوئی تھی۔

شیطانی خیال آیا کہ بزنجو بہت بڑا لیڈر ہے۔ اسے تو لوگ اپنی تصانیف اپنی دستخطوں کے ساتھ گفٹ کر کے دیتے ہوں گے۔ اور وہ اسے لا لا کر یہاں لائبریری کی زینت بناتا ہو گا۔ اُس کے پاس کہاں ٹائم ہو گا، یا کہاں شوق ہو گا کہ وہ بیٹھ کر یہ ساری کتابیں پڑھے گا۔ میری بے ایمانی نے مجھ سے اِدھر اُدھر الماریوں میں سے کتابیں نکلوائیں۔ اور جب میں نے انھیں کھول کر دیکھا تو ان کے ورق ورق کے ساتھ بزنجو کی لڑائی کے نشانات دیکھے۔ سوالیہ نشان تھے، حاشیوں پر تبصرے تھے، منتخب فقروں کے نیچے لکیریں کھچی ہوئی تھیں۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مجھے اپنے آپ میں کتنی شرمندگی ہوئی ہو گی!۔ بہت سی نایاب کتابیں میں نے بین الاقوامی بڑی بڑی لائبریریوں میں تلاش کے باوجود نہ دیکھی تھیں جو یہاں اِس دور افتادہ کونے میں دیکھیں۔ کتنی نایاب کتابوں کو یہاں دیکھ کر مانگنے کو جی للچایا............ مگر اس قدر دور ایک کونے میں موجود لائبریری سے کتاب مانگ کر کوئٹہ شہر لے جانے میں بڑی بے تکی تھی۔ فوٹوسٹیٹ کی سہولت اُس زمانے میں تھی نہیں۔ چنانچہ رہ گئیں' اور کچھ تو زندگی بھر پڑھنے سے بھی رہ گئیں کہ وہ کتابیں مجھے اور کہیں نہیں ملیں۔

قصہ مختصر جب لائبریری دیکھ چکا اور ساتھ والے کمرے پہنچا تو میر صاحب نے تعریف کروانے کی بچوں جیسی خواہش میں کہا، ''بابا، پسند آئی لائبریری؟''

اور میرا بچکانہ جواب تھا، ''بابا، اتنی بڑی لائبریری مجھے دے دیں، چالیس برس دے دیں، آپ سے بڑا لیڈر بن کر دکھاؤں گا''۔

اس نے صرف یہ تبصرہ کیا، ''بابا، اس سے بڑی لائبریری بھی مل جائے گی، 40 سال بھی

مل جائیں گے مگر ایمان، استقلال اور مستقل مزاج کمٹمنٹ تو باہر سے نہیں ملتی ناں!''۔

ربع صدی بیت گئی اس بات کو۔ کاش اب اُس سے ملاقات ممکن ہوتی تو اسے بتا دیتا کہ واقعی اُس سے بڑی لائبریری نصیب ہو گئی، 40 برس بھی مل گئے مگر بزنجو پن ہر خرِ موسیٰ کو تھوڑی ملتا ہے۔ کمٹ منٹ کی وحی ہر ایرے غیرے پر نہیں اترتی۔ اور کمٹمنٹ کی دیوی مہربان ہو، تبھی کوئی شخص اونٹوں پر سوار ہو کر سیاسی دورے کرتا ہے، ایک ایک بچے سے بات کرتا ہے اور شعور پھیلاتا ہے۔ بزنجو ہی کو ودیعت ہوئی تھی یہ خصوصیت۔ اور پھر تاریخ نہ تو فضول خرچ ہے اور نہ ہی اتنی فیاض کہ ضرورت کے بغیر ہر غیر مستند کو مستند بناتی پھرے۔

بزنجو صاحب بہت ثابت قدم سیاست دان تھا۔ اس نے مقصد بڑا رکھا، استقلال کے ساتھ رہا اور ضبط برقرار رکھا۔ سیاست کے میدان میں بزنجو سے بڑا صابر شاید ہی رہا ہو بلوچستان میں۔

کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص لائبریری سے پڑھنے کے لیے کتاب لے جاتا تو اُسے بہت خوشی ہوتی تھی۔ کوئی کتاب لے جانے کی اجازت لیتا تو میر صاحب کہتا، ''بابا! یہ لائبریری میں نے بنائی ہی آپ لوگوں کے لیے ہے''۔

بہرحال، رات کے کھانے پر بھی اس سے خوب باتیں ہوئیں۔ مگر اب وہ سیاست دان نہ تھا، لیڈر نہ تھا، بزرگ نہ تھا۔ وہ سادہ سا بلوچ میزبان بن گیا تھا؛ ''یہ ڈش لے لو، یہ بوٹی کھالو'۔ اتنی دیکھ بھال کرنے والا، اتنا روایتی آدمی؟۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بابا بزنجو خود بھی اچھا خاصا خوش خوراک تھا۔ اضافی بات یہ تھی کہ وہ کوئی پندرہ بیس جلا ڈالنے والی سبز مرچیں ایسے شوق اور رغبت سے کھا رہا تھا جیسے کوئی بھوکا بلوچ مسافر راستے میں پڑی ہوئی گاجر ہڑپ کر جائے۔ دوسری اضافی بات یہ تھی کہ کھانے کے بعد نسوار کی چٹکی لی اور بجائے مروج نچلے ہونٹ میں رکھنے کے اسے اوپر والے ہونٹ سے اڑسا دیا۔ ہم ابھی اس سٹائل پر حیران تھے کہ اس نے 555 برانڈ کا روغنی رنگ کا سگریٹ بھی سلگا لیا۔ یعنی بہ یک وقت نسوار اور سگریٹ۔ ہم نے تمباکو سے اس طرح نمٹتے کسی اور کو آج تک نہیں دیکھا۔ یعنی بہ یک وقت تمباکو نوشی بھی کرنا اور تمباکو خوری بھی کرنا۔ کہتے ہیں کہ نسوار

اس نے اس وقت شروع کی جب وہ سنڈیمن ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔(46)

بعد میں جب میں بابا کی تدفین پہ نال گیا تو اس کے بیٹے کو ہمارے مکالمے یاد تھے۔اس نے پُرنم آنکھوں سے گلے لگا کر وہ بات یاد دلا دی، ’’لائبریری نہیں دیکھو گے؟‘‘ مگر جرأت نہ تھی۔ لائبریری تو بزنجوئی ہاتھوں، آنکھوں کی عادی تھی۔اور وہاں تو بزنجوئی بلندی کھڑی چیلنج کرتی تھی۔ ہر لائبریری بولتی ہے۔اور بزنجو کی لائبریری تو بزنجوئی بول بولتی ہے ؛ پیار، دھیما پن، بلوچیت، عوامیت، مارکسیت .... ہمارے تو بس، پر جلتے ہیں۔اور پھر لائبریری والے نے تو لائبریری اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ دی تھی، مگر اس پگڑی کو تو جھنگ سے لے کر جھل تک اور سور بندر سے لے کر بندر عباس تک کوئی بلوچ اٹھانے والا نہ تھا، ہم کس باغ کی مولی تھے۔

مگر دوستو! یہی اعزاز کیا کم ہے کہ بزنجو بابا سے بڑے بول بولنے کے 30 برس بعد بھی ہم فکرِ بزنجو پہ قائم ہیں!!

29

شخصیت

میر غوث بخش بزنجو موزوں قد و قامت والا خوب صورت شخص تھا۔ بھرا ہوا جسم، سرخ و سفید شفاف و باوقار چہرہ، کھلی پیشانی، روشن سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، ہونٹوں پر لازوال مسکراہٹ، دودھ کی طرح سفید بال، چاندی جیسی سفید مونچھیں، ہمہ وقت تازہ شیو کی ہوئی داڑھی، بارعب مگر مدلل آواز، پرکشش شخصیت، مہر بھرے دل کا مالک، بہترین شخصی خصائل .... یہی غوث بخش بزنجو تھا۔

میر غوث بخش بزنجو بہت وجیہہ انسان تھا۔ وہ بہت پرکشش جسم و جان کا مالک تھا۔ سائیں کمال خان شیرانی اُس سے 1950ء کی دہائی میں ملا تھا۔ وہ اسے یوں بیان کرتا ہے، ’’میر غوث بخش بزنجو جس قدر ظاہری طور پر خوب صورت تھا، اسی قدر اس کی روحانی اور فکری صلاحیتیں بلند اور دل کش تھیں‘‘۔

بابا بہت ہی خوش پوش شخص تھا۔ اجلے استری شدہ کپڑے ہوتے تھے اور اس خوب صورت اور صاف لباس کے اوپر واسکٹ اس پہ خوب سجتی تھی۔

اُس کی خوش خوراکی کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یہ مہمان نواز شخص حاضرین کو چائے تو پلاتا رہتا تھا لیکن کھانے کے وقت بھی' وہ تمام موجود لوگوں کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتا تھا۔

میر صاحب نہایت ہی خلیق، ملنسار اور محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس طرح لوگوں سے ملتا کہ اجنبی تک یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ بابا نے اسے نہیں پہچانا۔ سب اس کے اپنے تھے۔ کوئی اس کے لیے بے گانہ نہ تھا۔

میر غوث بخش بزنجو کا ایک ملازم تھا، محمد رمضان ٹاپی نام کا۔ بزنجو صاحب اس سے بہت پیار کرتا تھا، اپنے بچوں کی طرح ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ رمضان ٹاپی بہت زبردست کھانے پکاتا تھا۔ ریڈیو پر گاتا بھی تھا، بالخصوص میر گل خان کی شاعری۔

میں تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں تین ساڑھے تین سال تک رہا۔ میر صاحب جب بھی لاہور آتا تو اپنے آنے کی اطلاع فون پر مجھے ضرور کراتا' حالاں کہ اخبار میں اُس کی آمد کے بارے میں خبر ہمیشہ چھپتی تھی۔ وہ وہاں قصور گردیزی کے ہاں ٹھہرتا۔ میں وہاں حاضر ہو جاتا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو جاتا، گلے لگاتا، گردن پر بوسہ لیتا اور اپنے پاس بٹھاتا۔ وہ اس بات کی پرواہ نہ کرتا تھا کہ میں اس کی پارٹی کی اہم میٹنگ کے وقت وہاں موجود ہوں۔ مجھے خاموش بیٹھنے کو کہتا اور اپنی میٹنگ وغیرہ جاری رکھتا۔ فارغ ہو جاتا تو مجھ سے گپ شپ کرتا۔ مجھ سے لاہور اور پنجاب کی باتیں پوچھتا اور پھر خود اپنی تازہ ترین سوچ مجھے نہایت تفصیل سے بتاتا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ سی آر اسلم بھی عموماً ہر بار اُس کی لاہور آمد پر ملنے جاتا۔ دو ایک بار ایسا ہوا کہ میں اُس کے پاس نہ جا سکا تو وہ سی آر اسلم سے شکایت کرتا، ''وہ نواب صاحب ملنے نہیں آیا۔ اسے بھیج دو''۔ اور میں دل میں دو چار زوردار قسم کے جھوٹ گھڑ کر رکھ لیتا۔ مگر اس کی شکایت تو مجھے دیکھ کر ہی دور ہو جاتی تھی۔ اور میرا جھوٹ ویسے ہی میرے ضمیر کو کوڑے مارنے، بعد کی زندگی میں وارد ہوتا رہتا۔

اتنے بڑے شخص کی شخصیت بھی تو بہت پہلو دار ہوتی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ اِس فانی دنیا کو کیسے بِتا گیا۔

اگر آپ کو ڈکشنری میں لفظ سادگی کا ترجمہ نہ ملے تو بس ایک شخص تصور میں لائیں، آپ

کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ شخصیت کا نام ہے؛ بابا بزنجو۔ وہ کسی اٹھائیسویں دنیا کی عجیب الخلقت جان دار کے بجائے عام آدمی جیسا لگتا تھا۔ گورکی نے لینن کی شخصیت کی اہم خوبی سادگی بتائی تھی اور یہی سادگی بزنجو صاحب کی معصوم شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھی۔ میر غوث بخش بزنجو بہت ہی جان دار قہقہہ لگا کر ہنستا تھا۔ جیتا جاگتا، ہنستا ہنساتا، جیلوں میں پھولوں کو پانی دیتا ہوا، مختلف سماجی پرتوں سے آئے ہوئے قیدیوں کو الٹے پلٹے لطیفے سنانے والا بزنجو۔ یہ شخص حبیب جالب شاعر کو پسند کرتا ہے۔ کتنی پسند کرتا ہے، ذرا فقرے کا پہلا حصہ بھی دیکھیں، ''کسی اور شاعر کا نام لیا تو جالب مجھے مارے گا''۔ اور فقرے کا دوسرا حصہ دیکھیں، ''جالب میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں اُس سے بہت پیار کرتا ہوں۔ اس نے تباہ حالی میں بھی اپنا بھرم رکھا ہوا ہے''۔ بابا کو فیض اور فراز بہت پسند تھے۔

بزنجو ہم جیسا تھا بھئی، ''حسن سے محبت کرنے سے گریز کرنا میرے نزدیک جرم ہے۔ ہر حسین چیز محبت کے قابل ہے۔ ایک مرد کے لیے عورت میں اتنی زیادہ کشش ہے اور حسن ہے کہ شاید اتنی پھول میں بھی نہیں۔ حسن سے مجھے بہت پیار ہے۔'' (نیا زمانہ، لاہور، ستمبر 1989)

بہت کوشش ہوئی کہ اس کو ولی اللہ قرار دے کر حکمرانوں کے لیے غیر ضرر رساں بنا دیا جائے۔ مگر وہ مہاتما، عظیم لیڈر، استاد اور حضرت نہ بنا۔ اسی لیے تو' اس نے خود کو بے حس اور بے فکر چوپایہ بننے سے بچا لیا۔ بزنجو نے پسے ہوئے طبقات کو' سائنسی افکار کو اپنا ہتھیار بنانے کے لیے قائل کیا، انھیں اپنا مجسمہ کھڑا کرنے نہ دیا...... مجسمہ تو ایسا پیڑ ہوتا ہے جس پر عورتیں اپنے ارمانوں کے پراندے نذرانہ کے بطور کاٹ کر لٹکایا کرتی ہیں، نوجوان اپنی محبوباؤں سے وصال کی مَنت کے بطور محبوبہ کا دیا ہوا رومال وہاں ٹانک آتے ہیں اور پوشیدہ امراض میں مبتلا انسان اپنی شفا کے کچکول لیے نعرے لگاتے ہیں۔ بزنجو نے ایسا نہ ہونے دیا۔

قلات اسمبلی میں حزبِ اختلاف کا لیڈر، بابائے بلوچستان، بابائے استمان، گورنر بلوچستان، وغیرہ وغیرہ۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کتنے بڑے سیاسی رتبوں کا مالک تھا۔ مگر اس شخص کے پاس کوئٹہ میں ذاتی مکان تک نہ تھا۔ نہ کچا، نہ پکا۔

جمہوریت، مکمل جمہوریت' مکمل بزنجو۔ بزنجو نے تین باتوں کو اپنی زندگی کا محور بنا رکھا

تھا؛ انسانیت، وطن اور جمہوریت............ یہ تینوں اس کی محبوب چیزیں تھیں۔ وہ اپنی جمہوریت پسندی کا اعلان بھی دھیمے انداز میں، بنا چیخے، بنا پکارے کرتا تھا۔ اپنی شخصیت کی طرح سادہ الفاظ میں، اپنی شخصیت کی طرح مکمل سچائی میں اور اپنی شخصیت کی طرح بے تکبری میں............اس کے فلسفے کا مغز جمہوریت تھی۔ جمہوریت پہ وہ کوئی ابہام نہیں رکھتا تھا۔

میر غوث بخش بزنجو نے کبھی اپنی سرداریت کو نہ ابھارا۔ اگر خدانخواستہ وہ اپنے اس کارڈ کو استعمال کرتا تو باپ دادا والی سرداری کی کرامت اور غوث کے بخشے ہوئے سیاسی ورکر کی شان والی شخصیات مل کر وہ قیامت ڈھا جاتیں کہ اس خطہ کے لوگ ایک صدی تک ایک دوسری غلامی میں بندھ جاتے............ اگر بزنجو صاحب سندھ، پنجاب اور اندرونِ بلوچستان کے بار بار کے سیاسی دورے نہ کرتا اور عام لوگوں، پارٹی ورکروں اور اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ میل ملاپ نہ رکھتا تو یقیناً ہم اسے کب کا پیر بنا چکے ہوتے۔ اور کس قدر فارمل ہوتی ہے پیر کی محفل۔ وہاں تو آٹو میٹک انداز میں ایک نفرت انگیز رکھ رکھاؤ، ایک بدتمیز قسم کی فارمیلٹی اور کثیف کھچاؤ بھرا ماحول بن جاتا ہے۔ بابا کی محفلیں تو ایسی نہ ہوتی تھیں۔ بالخصوص جب وہ قصور گردیزی کے ساتھ ہوتا یا سی آر اسلم کے ساتھ تو ایک بے تکلف انسانی نشست لگ جاتی۔

پارٹی کے ورکر، میٹنگوں محفلوں میں اس سے کھل کر بحث کرسکتے تھے۔ قصور صاحب کے لاہور والے گھر میں ہی ایک بلوچ نوجوان نے سب کے سامنے اُس سے کہا کہ، وہ قیامت کے دن میر صاحب کے خلاف یہ شکایت اللہ تعالیٰ کو پیش کرے گا کہ اتنے زیادہ عرصے سے بلوچستان میں سرقبیلوی نظام کو مضبوط رکھا ہی بزنجو صاحب نے۔ یہ واقعی بہت بڑا تنازع تھا۔ بابا بہت جز بز ہوا۔ دلائل کا تبادلہ ہوا اور دو تین گھنٹے تک یہ بحث چلتی رہی۔ نوجوان کے آخری فقرے تھے کہ، ''بابا آپ نے اپنے سرخ کمیونسٹ چوغے میں فیوڈلوں کو محض جسمانی طور پر نہیں چھپایا بلکہ آپ نے ان کے عزائم، ان کے رویوں اور نظریات کو بھی سرخ رنگ سے ڈھانپ دیا تھا''۔ .... مجھے یاد ہے بزنجو صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ''ابا! اگر میں مان بھی جاؤں کہ انھیں میں نے اپنے چوغے میں بچائے رکھا تو جب میں اپنا چوغہ اتار پھینکوں گا تو پھر حشر کے میدان میں تم بھی دیکھ سکو

گے کہ یہی لوگ میرے ہی چوغے میں چھپے ہوئے میری ہی پشت اور سینے پر چاقوؤں کے وار کرتے رہے ہیں۔ میں نے اپنے عذاب کا حصہ اسی دنیا میں ہی کاٹ لیا ہے''۔

ایک اور اہم بات یہ تھی کہ میر صاحب کو اپنی عام گفتگو میں اپنی جیلوں مصیبتوں کا ماتم کبھی کرتے نہ سنا گیا۔ وہ قید اور جیل کی زندگی کو اپنا سرٹیفکیٹ کبھی نہ بناتا تھا۔ وہ قربانیوں کی نمائش کرنے والا لیڈر نہ تھا۔ بہت اور طویل بات کرنے والا بزنجو، ہمیشہ خیال رکھتا تھا کہ کہیں گفتگو میں خودنمائی نہ آئے۔

بابا کو باغبانی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس کی لائبریری کے اردگرد سیب، انار، توت، زرد آلو، آلوچہ اور کھجور کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ گلاب، چنبیلی اور کئی دوسری قسم کے خوب صورت پھول بھی لگے ہوئے تھے۔ میر صاحب اکثر خود انھیں صاف کرتا تھا اور پائپ کے ذریعے اکثر اُن کی آبیاری کرتا تھا۔

اسے پرندوں کا بھی شوق تھا۔ لہٰذا اُس کی لائبریری کے سامنے باغیچہ میں خوب صورت مور پھرتے رہتے اور جب بادل و برسات کا موسم ہوتا تو میر صاحب باغیچہ میں بیٹھا ہوتا، اور اس کے سامنے مور نہایت ناز و ادا سے رقص کرتے اور میر صاحب خوب لطف اندوز ہوتا۔ (47)

بزنجو بابا کی سیاست کے درخشاں ستاروں میں سے سب سے خوب صورت مؤقف افغان انقلاب سے اس کی یکجہتی والا تھا۔ یہ شخص اِس انقلاب کی پشت پناہی کے لیے ڈونگان پہاڑ کی طرح کھڑا رہا۔ تقریریں، تحریریں، جلسے جلوس سب کچھ قربان اُس مزدور انقلاب کے لیے۔ میر بزنجو آخری بار 27 اپریل 1989ء میں انقلاب کے میلے میں شرکت کے لیے افغانستان گیا۔ تمام تر خطرات کے باوجود اس نے کئی مقامات کا دورہ کیا۔ اور انقلاب کے ساتھ اپنی یک جہتی دکھائی۔ بلاشبہ بزنجو صاحب کی ثور انقلاب کے ساتھ بے غرض و بے لوث کمک اور مستقل مزاج یک جہتی، پوری بلوچ قوم کے لیے فخر اور ناموس کی بات ہے۔

اگر کوئی پوچھے کہ میر غوث بخش بزنجو کی سب سے بڑی خصوصیت کیا تھی تو میرا جواب ہوگا؛ ''ثابت قدمی''۔ اس نے پہلی بار جب اپنی منزل متعین کردی اور راستہ چنا تو پھر کوئی کنفیوژن،

کوئی اَدل بدل‘ کوئی دایاں بایاں نہیں۔ یار دوست اِدھر اُدھر گئے‘ کوئی یہاں لپکا کوئی وہاں جھپکا مگر میر بزنجو گہری جھیل کی طرح‘ کوئی ارتعاش نہیں، کوئی پس وپیش نہیں۔ اس کے رفیقوں میں بے شک کئی لوگ دائیں چٹان سے گر پڑے اور کئی بائیں کھائی میں جا گرے۔ مگر جسے زمان نے بچانا تھا، آخر تک بچائے رکھا۔

29.1

بزنجو اور بچے

بزرگ سنی کے اپنے تقاضے اور ادائیگیاں ہوتی ہیں۔ اُس کا نام بابا شاید اس لیے بھی پڑا کہ ''بابا'' اس کا تکیہ کلام تھا۔ سب لوگ ہی اُس سے کم عمر ہوتے تھے تو سب لوگ ہی ''بابا'' ہوئے۔ اور وہ سب کو بچہ سمجھتا تھا، اپنا بچہ۔ پوری قوم کا بابا تھا وہ۔ ایک نفسیاتی عادت سی بن گئی تھی اُس میں شفقت کی۔ ہر ایک سے ایسے ملتا، ایسی ذاتی دلچسپی کی باتیں پوچھ لیا کرتا جس طرح ایک بزرگ اپنے بچے سے کرتا ہے۔ مگر وہ ایک بات کبھی نہ بھولتا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے بچے سے اس کی اولاد کی تعلیم کا تقاضا ضرور کرتا تھا۔

بزنجو صاحب بچوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ڈاکٹر عطااللہ بزنجو بتاتا ہے کہ بچے اکثر اس کے پاس لائبریری جاتے تھے۔ وہ بچوں کی خاطر جیب میں، یا الماری میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھتا تھا۔(48)

ایک اور واقعہ دیکھیے: ''مکران میں بل نگور پہنچے تو وہاں سیکڑوں کی تعداد میں لوگ اُس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھی ایک بھیڑ تھی۔ بابا جب اُن کے قریب گیا تو بچے بھاگ کر ساتھ والے سکول میں چلے گئے۔ بابا لوگوں سے ملے بغیر پہلے تو بچوں کے پیچھے پیچھے سکول گیا، وہاں بچوں کو پیار کیا، انھیں گلے سے لگایا اور اُن کے ماتھے چومتا رہا۔ اس کے بعد وہ مجمع میں آیا اور استقبال کے لیے موجود لوگوں سے ملا''۔(49)

میر غوث بخش بزنجو ایک مکمل انسان تھا۔ لاہور میں دورانِ تعلیم میرے بڑے بھائی میر و خان نے کوئٹہ سے مجھے فون کیا تو میں نے بزنجو صاحب سے ملنے کی فرمائش کی جو کہ اُن دنوں کوئٹہ آیا

ہوا تھا۔ دوسرے روز بھائی نے جب فون کیا تو بزنجو صاحب کی بہت تعریفیں کرنے لگا۔ جس خاص بات سے وہ متاثر ہوا، وہ یہ تھی کہ میر صاحب نے چائے تو منگوائی مگر جب چائے آ گئی تو بھائی کا کپ تو اُس کے سامنے رہنے دیا مگر اس کے کم سن بیٹے عزیز احمد کے سامنے سے کپ اٹھوا دیا اور اُسے چائے پینے نہ دی۔ اور وہ معصوم ایسے ہی بیٹھا رہا، جو بھائی کو برا لگا۔ مگر بزنجو صاحب نے اُسی وقت الماری سے ایک سیب نکالا اور بچے کو تھما دیا اور بچے کا ماتھا چوما۔ بھائی خوش تھا کہ ایسا لیڈر بہت اچھا ہوتا ہے، جسے بڑے اور چھوٹے سب کی ضروریات کا ادراک ہوتا ہے۔

میر غوث بخش بزنجو اپنی سیاست میں نوجوان خون کو شامل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا؛ ''............ مجھے اپنے باشعور نوجوانوں پر فخر ہے۔ جو عملی معنوں میں میری سیاست کے وارث ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے مشن کو آگے بڑھائیں گے............'' اس نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا؛ ''............ میں نے بلوچستان کی ترقی اور خوش حالی کا جو خواب دیکھا تھا، اس خواب کو پورا کرنے والے لوگ آپ ہی ہیں۔ آپ ہی میری سیاست کے وارث ہیں''۔

29.2

بطور استاد

میر غوث بخش بزنجو نے جمہوریت کو خود اپنے آپ پر، اپنی آل اولاد پر اور اپنے حلقۂ احباب پر باقاعدہ نافذ کر رکھا تھا۔ وہ صرف ریاستی آمریت کے خلاف نہ تھا بلکہ وہ تو نجی زندگی میں بھی آمرانہ رویوں کے خلاف لڑتا رہا۔ اسی وجہ سے بابا کی عادت بن گئی تھی کہ وہ بہت اچھی طرح دوسرے کی بات سنتا تھا اور پھر بڑی اپنائیت کے ساتھ معلوماتی انداز میں اپنا مؤقف پیش کرتا۔ بات کرنا بزنجو کا وطیرہ رہا۔ مجمع خواہ ہزاروں کا ہو یا دو افراد کا، بزنجو صاحب سمجھانے کا سی آر اسلم والا خصوصی انداز ہی استعمال کرتا۔ اس کی تحریر بھی اسی طرح استادوں والی ہوا کرتی تھی۔

میر صاحب دلیل کا، بحث کا، اختلاف رائے کا آدمی تھا۔ اس سے اختلاف کرنا ہو یا اتفاق، دلیل کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ مخاطب کی بات پوری طرح سنتا اور اپنی بات

پوری طرح سناتا۔

وہ مخاطب کی عمر، علم، اور عہدے کو نہ دیکھتا تھا بلکہ اپنا موَقف بہت تفصیل سے، بہت مدلل انداز میں بیان کرتا۔ تاریخی پس منظر سے شروع کر کے مثالیں دیتے ہوئے بھرپور طور پر اپنی بات دوسرے تک پہنچاتا۔ نہ حکم چلاتا، اور نہ ہی اپنے ماضی کی خدمات جتاتا بلکہ بالکل عام اور برابر کے آدمیوں کی سی محفل جمتی ۔ میر غوث بخش بزنجو گفتگو' جلسہ و دیوان اور مذاکرات کا بیٹا تھا۔ جاگیرداروں کی طرح اپنی بات دوسروں پر مسلط نہیں کرتا تھا بلکہ قائل کر کے' سوال جواب کے سیشن چلا کر اپنی بات دوسرے سے منواتا تھا یا پھر دوسروں کی بات مان لیتا۔

میر بزنجو نے اپنی سیاست کے اندر' اپنے ساتھیوں شاگردوں سے صلاح مشورہ کرنے اور ایک متفقہ فیصلہ کرنے کا مزاج ڈال دیا تھا۔ یک نفری فیصلہ میر صاحب کبھی نہ کرتا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے فیصلہ لے کر وہ عوام میں نکلتا تھا تاکہ انھیں بھی ہم مشورہ بنا سکے۔ وہ عوام سے کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔

وہ اپنی پارٹی میں بھی اکثریت کی رائے کو ترجیح دیتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کئی بار' بڑے بڑے اہم معاملات پر بھی' میر صاحب نے اپنی رائے سے بالکل الٹ بات مان لی' صرف اس لیے کہ وہ دوستوں کی اکثریت کی بات ہوتی۔

میر صاحب اختلافِ رائے کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ مختلف رائے رکھنے والے کو انقلاب دشمن نہیں کہتا تھا۔ بزنجو بہت کم فتوے بازی کرتا تھا۔ یہ بزنجو ہی تھا جو بڑے بڑے بول بولنے والے کو جھٹکتا نہ تھا، نہ ہی اس کا مذاق اڑاتا تھا بلکہ بہت دھیرج سے، بہت دلیل سے اس کی رائے تبدیل کرواتا تھا۔

ایک بار اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا میں نے پاکستان کا آئین پڑھا ہے؟۔ میں نے مہا انقلابیت اور خرنیشنلسٹی میں کہہ دیا: ''گم کریں بابا، یہ بھی کوئی پڑھنے کی چیز ہے! میں نہیں پڑھوں گا''۔ اس نے بس دو فقروں میں بات سمجھا دی، ''بابا، معلوم نہیں تم نے پاکستان دوستی میں یہ کہا ہے یا پاکستان دشمنی میں۔ بہرحال خواہ یہ تمہارا دوست ہے یا دشمن، اس کا آئین ضرور پڑھو۔

جس ملک کے ساتھ تمہارا واسطہ ہے دوستی میں خواہ دشمنی میں، اس ملک کا قانون، آئین، رسم و رواج، تاریخ جغرافیہ سب پڑھو۔ تمھیں اپنی حکمتِ عملی متعین کرنے میں آسانی ہوگی''۔

میرے اچھے بابا، بہادروں کی تلوار بازی کی خوب صورت نشانیاں اور بھلا کیا ہوں گی! جُگ جُگ چین سے رہو۔

اور کیا شاگرد تھے اس کے؟ کیا رفیق تھے اس کے؟ اس کے انتقال کے بہت عرصہ بعد اس کا ساتھی احمد نواز بگٹی کراچی سے آیا ہوا تھا اور کوئٹہ میں MPA ہاسٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں اس سے ملنے گیا۔ وہ رخصت کرنے گیٹ تک آیا۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے گیٹ پر اس سے حافظ کا یہ مصرع پڑھا۔

''ما درِ پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم''

(ہم نے پیالے میں یار کے رخ کا عکس دیکھا ہے)

اور کہا کہ، ''آپ خود بھی بہت اچھے ہیں مگر آپ سے ایک شخص کی خوشبو بھی آتی ہے، اسی لیے ملنے چلا آتا ہوں''۔ اس کا جواب تھا، ''ہاں جانتا ہوں۔ اس لیے کہ خود مجھے تم سے بات کرتے ہوئے وہی شخص یاد آجاتا ہے''۔ اور یہ عام احمد نواز نہ تھا، وہ تو بزنجو کی تربیت سے کندن ہو چکا احمد نواز بگٹی تھا۔ وہ احمد نواز نہیں جو اچی سن کا پڑھا ہوا تھا۔ بے پرواہ، مذاق و مزاح کا ہمہ وقتی موجد۔ ہر وقت ہنسنا۔ کیبرے ڈانس کا شیدا، ریس گھوڑے کا مالک، ہمیشہ خوب صورت خواتین کے جھنڈ میں۔ اور جب بھی بلوچستان سے باہر جاتا تو اپنی دوست خواتین کے لیے خالص ریشم کے تھان کے تھان لے جاتا۔ ماقبل بزنجو کا احمد نواز جواری تھا، ایک مقبول پلے بوائے' ہر قسم کی لڑکیوں سے دوستی رکھتا تھا بالخصوص کیبرے لڑکیوں سے۔ وہ ان پر پیسہ پانی کی طرح خرچ کرتا تھا۔ (50) وہی احمد نواز، بزنجو کی تربیت گاہ میں سے نکل کر ایسا لیڈر اور بزرگ بنا کہ اس سے ملنے' چل کر جانے کو دل کرتا تھا۔ حلیم الطبع، ٹھنڈے دل و دماغ والا اور حالات کا زبردست نباض۔ ہر وقت پڑھتا رہتا۔ سائنس فکشن اس کا پسندیدہ میدان تھا۔

1985ء میں ماسکو میں انٹرنیشنل یوتھ فیسٹول منعقد ہوا۔ دنیا بھر سے آنے والے

کمیونسٹ نوجوانوں کے اِس میلے میں ساٹھ ہزار افراد نے شرکت کی۔لڑکے لڑکیوں پر مشتمل چالیس رکنی پاکستانی وفد کا سربراہ میں تھا۔ہمیں ماسکو میں یوری گگارین سٹریٹ پر سوویت یونین کے ٹریڈ یونین کے ہوٹل ''سپوتنک'' میں ٹھہرایا گیا تھا۔دنیا کی چند ممتاز شخصیات کو بھی یہاں مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں سے امریکی کمیونسٹ پارٹی کی رہنما انجیلا ڈیوس بھی تھی۔پاکستان سے میر غوث بخش بزنجو کو بلایا گیا تھا۔اُسے کمیونسٹ پارٹی کے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔میں نے کام کی زیادتی اور اپنی بے پرواہی میں اُس سے ملنے میں دیر کر دی۔نااہل شاگرد نے اُسے کیا ڈھونڈ نکالنا تھا، اچھے چرواہے نے ساٹھ ہزار انسانوں کے ریوڑ میں بھی اپنی بھیڑ کو ڈھونڈ نکالا۔س نے سوویت پارٹی اور سرکار کو سر پر اٹھا لیا کہ شاہ محمد ڈھونڈ کے دو۔

قاصد تو ملک الموت سے بھی زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔میں ملنے چلا گیا۔ہم ملے، بہت باتیں ہوئیں۔بہت چمک دار اور مسرور آنکھوں سے وہ اس مقام تک پہنچنے والے اپنے بچے کو دیکھتا رہا۔ظاہر ہے جتنا فخر ایک بزرگ کو اپنی اولاد کی ترقی پر ہوتا ہے وہی فخر و اطمینان اس کی آنکھوں میں تھا۔میں نے اسے اس قدر خوش کبھی نہ دیکھا تھا۔قصہ مختصر، اس سے ملاقات کے ایک آدھ دن بعد افغان وفد سے میری ملاقات طے تھی۔ہم جب افغان نوجوانوں کے وفد کے ہوٹل گئے تو وہاں افغان وفد کے سربراہ اور اُس کی خلق پارٹی کے پولٹ بیورو کے متبادل ممبر فرید مزدک نے باتوں باتوں میں میر غوث بخش بزنجو سے پچھلی رات اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔پھر اچانک اُسے یاد آیا کہ میر صاحب اپنا سگریٹ جلانے والا لائٹر اُس کے کمرے میں بھول گیا۔میں نے کہا، مجھے دے دو، میں نے جانا ہے، میں پہنچادوں گا۔مگر اس نے میر صاحب کو فون کر کے پوچھا کہ ''کیا میں لائٹر شاہ محمد کو دے دوں؟''۔ ٹیلی فون رکھ کر مزدک جب پلٹا تو اپنے دوستوں کے سامنے بزنجو صاحب کے جو فقرے دہرائے تو سب دنگ رہ گئے۔بزنجو نے فرید مزدک کو کہا تھا، ''یہ نوجوان میرے نظریے، میری سیاست، میری تحریک اور میری پارٹی، میرے سب کچھ کا وارث ہے''۔

تصور کیا جا سکتا ہے اس محفل میں میری توقیر کس قدر بڑھ چکی ہوگی۔عالمی بلوچ کارواں کا سربراہ اپنی ساری زندگی کی سیاسی کمائی کا وارث کسی کو ٹھہرائے.........فرید مزدک اور اس کے

دوستوں نے بابا کا یہ فقرہ فیسٹول میں شریک دیگر ممالک کے لیڈروں کو بھی بتایا تو انڈیا، ویت نام، سوویت یونین ....اور اس طرح پوری دنیا کے کمیونسٹ نوجوان بہت متاثر ہوئے اور میں بارہ دن تک ایک راج دلارے کی طرح عالمی کمیونسٹ تحریک میں نمایاں رہا۔

(اس کی وراثت کی لاج میں نے کتنی رکھی؟

اس کی وراثت کی لاج ہم نے کتنی رکھی؟)

جناب عزیز بگٹی نے ایک بار کہا تھا'' چاہے نواب بگٹی ہو یا نواب مری، سردار مینگل ہو یا امان گچکی، وہ چاہے جس کشتی کے سوار بنے ہوں لیکن اُن پر بزنجو کی چھاپ کسی نہ کسی حوالے سے ضرور نظر آئے گی۔شاید ہی کوئی ایسا تعلیم یافتہ بلوچ نظر آئے جس کی سیاسی تربیت میں میر بزنجو کا عکس نہ ہو''۔(51)

29.3

بطور مقبول لیڈر

میر غوث بخش بزنجو اپنی پوری زندگی گارڈ اور باڈی گارڈ سے پاک رہا۔زندگی بھر یہ فیوڈل نمائش اس نے نہ کی۔نہ کارواں کے آگے پیچھے بدرنگ کھوکھلی گارڈ بردار گاڑیاں چلیں، نہ جلسوں کے گرد راکٹ لانچر سجے اور نہ رہائش گاہ پہ کوئی مورچہ بنا۔بس عوام میں سے تھا، عوام کے طرز اپنائے رہا۔

مگر اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ بزنجو بابا عام آدمی تھا۔وہ بلا مبالغہ بلوچستان کا معزز ترین اور مقبول ترین شخص تھا۔وہ تو بلوچ کا رہبر، لیڈر، باپ سب کچھ تھا۔جن لوگوں کو بلوچی زبان وادب سے ذرا بھی واقفیت ہو تو وہ بلوچی زبان وادب کے بہت بڑے نام میر عاقل خان کو ضرور جانتے ہوں گے۔وہی عاقل خان جو بلوچی ڈکشنری، گرائمر، بلوچی زبان وادب کی تاریخ اور اس کی لسانی تشکیل کا انسائیکلو پیڈیا تھا۔بلوچستان یونیورسٹی کے اس بہت ہی قابلِ احترام استاد کی زبانی بزنجو کی قدر کا اندازہ لگائیں؛

''لندن میں میرے تھائی رائیڈ کا آپریشن ہوا۔ڈھائی گھنٹے کا آپریشن، 24 گھنٹے تک

بے ہوش رکھا............خود بیمار بزنجو' بیمار پرسی کے لیے آئے۔ میری پیشانی چومی اور محبت بھرا ہاتھ' سر پہ پھیرا اور مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا؛'' بابا زوت جوڑ بۓ۔ دلا مزں کن'' میں کہنا چاہتا تھا؛'' خدا آپ کو سلامت رکھے، ہم ہوں تو کیا' نہ ہوں تو کیا!!''۔(52)

29.4

بطور شکست خوردہ لیڈر

کہتے ہیں کہ'' دانا چاند کی طرف اشارہ کرتا ہے تو احمق صرف اُس کی انگلیاں دیکھتے ہیں''۔ کچھ ایسا ہی ہمارے سیاست دانوں نے بزنجو کے ساتھ کیا تھا۔

میر غوث بخش بزنجو نے 1988ء کے الیکشن میں حصہ لیا۔ یہ اُس کا آٹھواں الیکشن تھا۔ وہ دو جگہوں سے کھڑا ہوا مگر خضدار و مکران کے سیاست کاروں نے کانوں کو پھاڑ ڈالنے' دل بٹھا دینے اور بھاگ سُلا دینے والا دھماکہ کیا۔ ایسی انتہا پسند باتیں، ایسے بلند بانگ دعوے، ایسے بے سروپا وعدے............اور پھر بلوچ نے اپنی ہتھیلیوں پر سے خوش قسمتی کی لکیر کھرچ ڈالی۔ میر کو ووٹ نہ دیا۔ میر صاحب انتہا پسند نعرے بازی کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ دونوں سیٹوں سے۔ سانحہ تھا یہ بلوچستان اور بلوچستانیوں کے لیے۔ ہر بلوچ خواہ وہ جہاں بھی تھا شرمندہ ہو گیا۔ سننے والوں کے ہوش اڑ گئے۔ حتیٰ کہ غیر بلوچوں کے گلے خشک ہو گئے۔ غیر ملکی مبصر ہکا بکا رہ گئے۔

یہ گویا ایسا تھا جیسے چلتن پہاڑ گر جائے۔ لوگ ماتمی شاعری کرنے لگے، تاسف کے گیت پیٹنے لگے۔ مگر میر بزنجو کے چہرے پہ غصہ' غم' مایوسی' پریشانی یا پشیمانی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس نے نہ تو عوام کو کوسا، نہ ساتھیوں دوستوں اور مخالفوں سے گلہ مند ہوا۔ بلکہ اس شکست کو اس نے بہت کھلے دل سے تسلیم کیا............اس نے بزنجو بن کر، بزنجو پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت شائستہ بہت جمہوری طور پہ یہ تاریخی فقرے کہے؛

''لوگوں کا فیصلہ ہے، میں تسلیم کرتا ہوں''۔

وہ اُسی انتہا پسندی سے ہار گیا (ووٹوں میں، موقف میں نہیں) جس کے خلاف زندگی

بھر اس نے لڑائی کی تھی۔ پورے پچاس برس تک بڑی جرأت مندی، بہادری اور استقلال کے ساتھ انتہا پسندی اور مہم جویانہ سیاست کا مقابلہ کیا اور سخت دباؤ کے باوجود اپنے موقف پہ ڈٹا رہا۔

اس کا کہنا تھا؛'' انتہا پسند خواہ دائیں بازو کا ہو یا بائیں بازو کا، وہ ہمیشہ بہ یک وقت موقع پرست ہوتا ہے''۔

کیا ولی اللہ تھا بزنجو، دیکھو اُس کا بڑا پن اور دیکھو اُس کی ولی گیری............الیکشن ہارنے کے بعد انٹرویو میں کہا؛'' جن نوجوانوں نے ہماری مخالفت کی ہے، بنیادی طور پر وہی نوجوان میری سیاست کے وارث ہیں''۔ (پھر یہ پیش گوئی ہم سب نے سچ ہوتے ہوئے دیکھی)۔

دنیا میں بھلا کس بڑے شخص نے انتخابات میں شکست کے بعد ایسی سنہری بات کہی تھی، سوائے بزنجو کے؛'' ہم نے ایک محاذ پر شکست کھائی ہے، جنگ میں نہیں۔ اور جنگ صرف ہم جیت سکتے ہیں کیوں کہ ہماری سیاست کی جڑیں عوام میں ہیں۔ ہم عوام کی بالادستی پر یقین رکھتے ہیں............اور عوام کو فتح کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کسی مردے کا دوبارہ زندہ ہونا''(53)

یہ تو ہم تصور نہیں کر سکتے کہ بزنجو الیکشن میں کوئی غیر اخلاقی ذریعہ استعمال کرنے کا سوچتا بھی ہو۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ جب انگریز نے بلوچستان پر قبضہ کرنے کی ٹھانی تو اس نے اس علاقے کی جاسوسی کرنے کے لیے اپنے ایک آدمی کو بھیجا تھا۔ وہ گھوڑوں کے تاجر یعنی (Horse Trader) کے روپ میں بلوچستان آیا تھا۔ اُس دن سے مرکزی حکومت کے لیے ہارس ٹریڈنگ بہت کارگر طریقہ رہا ہے، بلوچستان کو دبائے رکھنے کا۔ آج تو عملی صورت یہ ہے کہ ہمارے صوبے میں اِس ٹریڈ کے علاوہ آپ بڑے پیمانے کی سیاست کر ہی نہیں سکتے۔ انسانوں کی آبادی مکمل طور پر Horses کے اصطبل کا روپ دھار چکی ہے۔ بزنجو نے ہر جرم کیا ہوگا، مگر نہ اپنی بولی لگنے دی اور نہ کسی اور انسان کو خریدنے کا تصور کیا۔

قصہ مختصر بزنجو الیکشن ہار گیا۔ گو کہ آج فیوڈل نظام داخلی طور پر بہت کمزور تو نہیں ہوا، البتہ اس کی شکل وصورت ایک بھیانک صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس بنیاد پرست نظام کو سہارا دینے میں عالمی سامراج یعنی امریکہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ امریکہ نے ہمارے سماج کی اپنی عمر کی فطری

بڑھوتری کو ہی گلے سے پکڑا ہوا ہے۔ مگر میں اس بات کا دل سے قائل ہوں کہ بلوچستان میں اس عفریت سے اگر کسی نے شعوری طور پر زور آزمائی کی، اُن میں بزنجو صاحب صفِ اول میں موجود رہا، جس وقت بزنجو صاحب کا کندھا فیوڈلزم کی سواری بننے سے منکر ہوگیا، تب ہی ہر قبیلے میں دس دس پندرہ پندرہ سردار سر ابھارنے لگے۔

اسی شکست نے بالآخر خود بزنجو کو بھی، اور دیگر جمہوری قوتوں کو بھی، نیز عوام کو بھی فیوڈلوں کے نظریاتی قبضے سے آزادی دلانی شروع کی۔ چند ہی مہینوں میں فیوڈلوں سے، اور فیوڈل رویوں سے عوام کو اِس نظام کی اصلیت کا پتہ چل گیا۔

بزنجو کی شکست غالباً ایک اور دور کی ابتدا کی نشانی بھی تھی۔ بلوچ قوم کا شاید سیاسی ذوق ہی تبدیل ہو رہا تھا۔ سرمایہ داری نظام جاگیرداری سے مل جائے اور بنیاد پرستی کا بھی تڑکا لگایا جائے تو عمومی طور پر عوام کے ذوق (taste) میں تنزل آجاتا ہے۔ اب تو الیکشنوں کے نتائج دیکھیں تو شاہ لطیف کی شاعری یاد آتی ہے؛

میں نے اس کو درخت سے باندھا تاکہ یہ اس کی کونپلیں کھائے
حیف یہ خوگرِ خس و خاشاک، خس و خاشاک ہی اسے بھائے

29.5

لکھاری کے بطور

میر غوث بخش بزنجو کو بہت زیادہ لکھنے کا موقع نہ ملا۔ وہ تقریر کا، لیکچر کا، زبانی استادی کا آدمی تھا۔ ایک بہت ہی بڑی لائبریری رکھی اس نے۔ جیلوں نظر بندیوں میں بے تحاشا مطالعہ کیا، مگر لکھا بہت کم۔

میر صاحب نے جب اور جو کچھ بھی لکھا، بالکل اُسی طرح لکھا جس طرح کہ وہ بولتا تھا۔ میر اپنی زبانی یا کبھی کبھی لکھی ہوئی تقریر میں سامعین کے جذبات سے بہت کم خطاب کرتا تھا۔ میر صاحب ذہنوں سے مخاطب ہوتا تھا۔

30

سکوتِ شاشان

میر غوث بخش، موت کے معاملے میں بھی بہت ہی خوش قسمت شخص واقع ہوا۔ اُس کی موت نہ تو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی۔ جہاں وہ اپنے نظریاتی سیاسی ساتھیوں کو کچھ بتائے بنا، کچھ سمجھائے بنا فوت ہوجاتا۔ اور نہ ہی اس قدر طویل بیماری رہی کہ دوسروں پر بوجھ بنتا۔

جولائی 1989ء میں جنگل کی آگ کی طرح یہ بدبخت خبر بلوچستان کے طول و عرض میں پھیل گئی کہ بلوچستان کے بابا کو کینسر ہوگیا ہے۔ لبلبے کا کینسر جگر تک پھیل چکا تو اسے بیماری کا پتہ چلا۔ پھر وہ اس تشخیص کی تصدیق اور مزید علاج کی غرض سے لندن چلا گیا۔ وہاں سے 15 جولائی کو واپس کراچی آیا۔ کمزور تھا، جگر اپنی ناکامی کا عکس بابا کے چہرے اور آنکھوں کی پیلاہٹ میں دے چکا تھا اور عوام الناس کراچی ایئرپورٹ پر زندگی میں پہلی بار زور زور سے رو کر اس کا استقبال کر رہے تھے۔ انگلستان کے ڈاکٹر اُسے لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ یوں بقول بابا کے، ”اصل جنگ میرے اور کینسر کے بیچ ہے اور میں یہ جنگ استقلال، صبر، قوتِ ارادی اور عوام کی نیک خواہشات کی بنیاد پر لڑوں گا۔ اور میں ہار مانوں گا نہیں“ .... اس شریف انسان نے اعلان کیا کہ، وہ علاج کے

ساتھ ساتھ روزمرہ سیاسی کام جاری رکھے گا۔

وہ کراچی میں زیرِعلاج رہا۔ ہسپتال میں داخل تھا۔ ملنے پر پابندی تھی مگر وہ ورکروں دوستوں کو دور سے پہچانتا تھا اور خود ہی دروازے سے بلا کر سر پر ہاتھ رکھتا، انھیں رُلا دیتا.......... اور پھر خود بھی رو پڑتا.......... پیار رُلاتا ہے بھئی !!۔

مگر روتے رلاتے اس نے یہ بھی تو کہا تھا، ''مگر ایک بات بتادوں کہ میری موت کے بعد تمہارا سر نیچے نہ ہوگا۔ میں نے ساری عمر مخلوق کی خدمت کی ہے۔ میں نے سیاست کے نام پر نہ دولت جمع کی نہ بنگلے اور جاگیر ہتھیا لیے۔ میں اپنی آخری سانس تک انسانوں کے حقوق کی خاطر لڑوں گا۔ دیگر ہزاروں کینسروں کی طرح تم لوگوں کی حوصلہ افزائی سے میں اس کینسر کا سامنا کروں گا۔ میری سیاست کا وارث مزدور اور کسان اور محکوم طبقہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے مشن کو آخر تک پہنچائیں گے''۔(54)

بیماری کے دوران دنیا بھر سے دانش ور، سیاست دان اور سربراہانِ مملکت اپنے اپنے طریقے سے اس کی مزاج پرسی کرتے رہے۔ بالخصوص ہندوستان کے وزیراعظم راجیو گاندھی اور افغانستان کے سربراہ ڈاکٹر نجیب اللہ نے اسے ذاتی خط لکھ کر اس کی مزاج پرسی کی اور اس کی صحت یابی کی خواہش کی۔

جی ایم سید وہیل چیئر پر اس کی مزاج پرسی کو آیا۔ یہ دونوں بہ لبِ مرگ بھی ایک گھنٹے تک سندھ بلوچستان کی بھلائی کے بارے میں بولتے رہے۔ نواب بگٹی اور شیر باز مزاری سے بلوچی حال حوال کیا۔ یہ شخص مرگ و زیست کے دوراہے پر لیٹے لیٹے بھی افغان انقلاب کے حق میں بولتا رہا۔ قومی سوال پر لیکچر دیتا رہا۔ جمہوریت پر انٹرویو دیتا رہا۔ سیکولرازم تبلیغ کرتا رہا۔ محمود خان اچکزئی سے بلوچ پشتون بھائی چارے کا عہد لیتا رہا۔(55)

بیگم نصرت بھٹو ایک گھنٹہ اس بڑے انسان کے ساتھ رہی۔ بابا نے معراج خالد سے نرم گفتاری کی۔ ہزاروں پارٹی ورکرز سے ملاقاتیں تو روزمرہ کا معاملہ تھا۔ آخر تک ملاقاتیوں کی پابندی کو منع کرتا رہا۔

وہ عیادت کے لیے آنے والوں کو بتاتا تھا کہ ''جو بیماری مجھے لاحق ہے اس کی دہشت بہت زیادہ ہے۔ لیکن میں خود زیادہ پریشان نہیں ہوں۔ کیوں کہ جب حیات ہے تو موت بھی ہے۔ اور انسان کو اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اس میں اگرچہ مصائب کا حصہ زیادہ ہے لیکن یہ مصائب میں نے اپنے وطن اور عوام کے لیے جھیلے ہیں۔ یہ کسی پر احسان نہیں ہے''۔

وسیع بلوچستان کا ہونہار فرزند اور بلوچوں کا فکری و روحانی استاد میر غوث بخش بزنجو نصف صدی تک سیاست کے آسمان پہ جگمگاتے، اپنی قوم کے دشمنوں کی نیندیں اڑاتے اور بلوچ قوم کے نام و ناموس کو آسمان کی بلندی عطا کرتے کرتے بالآخر گیارہ اگست 1989 کو علی الصبح اپنے آباؤ اجداد کے پاس چلا گیا۔

بابا بزنجو کی آخری خواہش تو دیکھیے ؛

> ''میرا جنازہ ہواؤں کے دوش پر نہ لے جایا جائے۔ میری ساری زندگی پا برہنہ؛ سر برہنہ لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے گزری ہے۔ میری میت بھی انھی راستوں سے گزرنی چاہیے جن پر میرے لوگ چلتے ہیں۔ وہ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہی سہی، ان میں گڑھے اور کٹاؤ بھی ہیں مگر وہ میری دھرتی پر غاصب حکمرانوں کی بے انصافیوں کے لگائے ہوئے زخم ہیں۔ جب ان پر سے بیمار جھٹکے سہتے ہوئے گزر سکتے ہیں، درد سے نیم جان عورتیں ان سڑکوں پر سفر کر سکتی ہیں تو میرے بے جان بدن کا اس سفر کی مشقت سے کیا بگڑے گا؟۔ میرا آخری سفر اپنے ناداروں کے ہجوم؛ ان کے پسینے کی خوشبو، ان کی محبتوں اور بے قراریوں سے محروم کیوں رہے؟''۔

ملک الموت نے میر غوث بخش کو برف پوش صندوق میں تو ڈلوا دیا مگر وہ یہ بھول گیا کہ ''انسان دوستی'' کو موت نہیں آتی۔ نظریہ، عوام اور انقلاب کو کون پچھاڑ سکتا ہے۔ تاریخ کو کون مار سکتا ہے، استقلال کو کون روک سکتا ہے۔ اسی نے تو وصیت کی تھی کہ میری میت ہیلی کاپٹر سے نہیں ایمبولنس کے ذریعے میرے گاؤں لے جائی جائے، اپنے عوام کی گلیوں کے بیچ سے، ان کے ورک

پلیس کے درمیان سے‘ ان کے مجمعے اور دیوان کے اندر سے۔ زندہ تھا تب بھی عوام کی گلیوں میں سے گزرتا تھا‘ اس کی میت بھی انھی راہوں سے گزرے۔ زندگی بھر استقامت‘ موت تک کی استقامت‘ اور بعد از مرگ بے جان لاش بھی اسی استقامت کی گواہی دے۔

میر غوث بخش بزنجو اس بے وفا دنیا میں 73 برس تک جیا۔ تمام دکھوں تکلیفوں کے باوجود اپنی زندگی، ایک کوالٹی لائف بنا کر جیا۔ زندگی کو مُردوں کی طرح گزارنے والے سماج میں میر غوث بخش بزنجو مرتے دم تک زندہ رہا۔ موت آئی تو عام آدمی کی طرح نہ مرا۔ سٹیٹس مین شپ کی موت ہوئی بلوچستان میں، عظمت کی موت، محکم جمہوریت پسندی کی موت .... بلا شبہ اس شخص کی موت ہوئی جس کا بسترِ مرگ پہ اعترافی اعلان تھا: ’’میں زندگی بھر وطن اور اہلِ وطن سے عشق کرتا رہا‘‘۔ بلا شبہ بزنجو دو چیزوں سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا: انسانیت سے اور وطن سے۔

میں اپنی الگ بات کرنے کے لیے ایک بار پھر حسین شہید سہروردی کی بات دہراؤں گا: ’’میر غوث بخش بزنجو ملک کی عظیم شخصیت ہے۔ مگر اس کا گناہ یہ ہے کہ وہ ایک بلوچ گھرانے میں پیدا ہوا...... کاش وہ بنگال یا پنجاب کا لیڈر ہوتا تو اس کی عظمت کا پتہ لگتا‘‘۔ سہروردی کا خراجِ عقیدت اپنی جگہ محترم، مگر میرا خیال ہے کہ اسے بلوچستان ہی میں پیدا ہونا چاہیے تھا، یہیں کا لیڈر ہی ہونا چاہیے تھا۔ بلوچ تو ایک محبوب قوم ہے۔ وہ اپنے اچھے انسانوں کو مرنے کہاں دیتی ہے، بھولنے کہاں دیتی ہے۔

میر غوث بخش بزنجو ایک ادارہ تھا، ایک راہنما، ایک تحریک، ایک استادِ کامل، ایک روشن چراغ، ایک شفیق باپ، ایک رہبر، ایک رہنما، ایک انجمن، اور ایک آہنی دیوار تھا۔ وہ بلوچستان کی کشتی کا نوح تھا۔ وضع دار شخص تھا۔ ایک سکول تھا...... بلوچ تاریخ کا سکول‘ سیاست وشرافت کا سکول‘ شخصیت ساز سکول‘ دلیل و استدلال کا سکول‘ صبر و برداشت کا سکول۔ بلا شبہ بلوچ قوم‘ جمہوری عوام اور دنیا کے نیکی پسند انسانوں پہ بزنجو کی صورت رزق بخش بارش کا ایک فرحت بخش ریلا آیا‘ برسا اور چلا گیا۔ جب چلا گیا تو پتہ چلا کہ اس کی موت تو ایک زلزلہ تھی۔ زمین پہ جب یہ بڑا زلزلہ آیا تو ہر بلوچ کا کواڑ کھڑکا۔ اس رات کئی لوگوں نے چولہے نہ جلائے۔ کئی لوگوں نے ماتم میں گھر

کی بتیاں بجھادیں۔

اور جب بابا انتقال کر گیا تو میں ایک بار پھر اس سے ملنے چلا۔ صرافہ بازار میں PNP والوں نے ایک تعزیتی رجسٹر رکھا تھا۔ اس پہ کیا لکھتا، یہی کہ، ’’تو نے جسے بیٹا کہا، اپنی سیاست کا وارث کہا اور ایک بار نہیں بار بار کہا۔ وہ تو بس............‘‘۔ کبھی لاشعوری اور جذباتی طور‘ پر اور کبھی شعوری اور غیر جذباتی طور پر روتے ہوئے کاروان کے ساتھ نال پہنچا تو وہاں پوری قوم رو رہی تھی، سارے وارث غم زدہ تھے، بزرگ و جواں اشک آلود چہرے لیے نال میں موجود تھے۔ لوگوں کا جم غفیر قیامت خیز گرمی میں جمع تھا۔

میر صاحب کی میت کو اس کے داماد اسلم کے مکان پر عام دیدار کے لیے رکھا ہوا ہے۔ مکان تک جانے کے لیے انسانوں کے اِس سمندر میں لوگوں کو ایک قطار کی شکل میں جاتے دیکھا۔ ہم بھی قطار میں کھڑے ہوئے...... سیاست کی خاطر اونٹوں پر سوار ہو ہو کر جھونپڑیوں میں پھرتے رہنے والے کے دیدار کے لیے تیز کڑکتی دھوپ میں لوگ قطار میں کھڑے رینگتے رہے۔ ان لوگوں میں عام مزدور، کسان، اور دہقان بھی تھے‘ اور سردار، میر معتبر بھی موجود تھے۔ مولوی، حاجی، سنی، ذکری، مرزائی، جوان، بوڑھے سب مجتمع تھے۔ یہ مجمع برصغیر کے ایک بہت بڑے انسان کی موت پر اکٹھا ہوا تھا۔ روتے، ہچکیاں لیتے ہوئے، غم سے نڈھال عقیدت مند تھے جنھیں اس شخص سے پیار تھا، اس کے خیالات سے اتفاق تھا اور اس کے نظریات سے وابستگی تھی۔ غم کی اس فضا میں مرحوم کے لیے احترام کے عمیق جذبات کی بالا دستی تھی۔ وہاں اس کی میت پہ‘ یا اس کی قبر کے کنارے اسے دفنانے کے بعد اس کے گاؤں سے رخصت ہوتے ہوئے لوگوں نے یقیناً اپنے آپ سے بہت سے عہد و پیمان باندھے ہوں گے۔ بڑے لوگوں کی موت چھوٹوں کا احتساب ہوتی ہے۔ آدمی خود اپنا جج بن جاتا ہے اور بڑے شخص کی بڑائی کے تناظر میں اپنے آپ کو، اپنے قول و عمل کو ٹٹولتا ہے اور تفکر و خود تنقیدی ایک مصمم فیصلے کی صورت اظہار کرتی ہے۔

میر صاحب کے تابوت کے قریب پہنچا تو سب کی طرح میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ (نہ رونے والا بھی انسان ہوتا ہے کیا؟) اپنی ذمہ داری اور اس کے دیے ہوئے لقب سے وفا کرنے

کا عہد اس کے تابوت کے سامنے دہرایا کہ وہ اپنی سیاست کا ہمیں وارث کہتا تھا،............ وہ خود بھی تو کسی کی سیاست کا وارث تھا!! سچا وارث تھا۔ یوسف عزیز کی شروع کردہ تحریک کو وہ اس قدر احسن طریقے سے' اور کئی گنا قوت دے کر آگے بڑھاتا رہا تھا۔

ہزاروں انسانوں نے اپنے عظیم لیڈر اور انسانوں کے محسن کو سپردِ خاک کیا۔

بزنجو اور بلوچستان ایک صدی تک ساتھ رہے ہیں۔ اور جب تک سولائزیشن باقی ہے، انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تاریخ اس کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اس بلوچستان ساز تاریخی ہستی کو ہماری تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

گنگوفسکی نے سچ کہا تھا؛

''وہ لوگ جنھیں بزنجو کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس غیر معمولی شخص کو یاد کرتے رہیں گے جو فراخ دل، شریف النفس، بااصول اور انسان دوست تھا''۔(56)

بزنجو کے آخری فقروں میں اپنے نامہ اعمال کو دائیں ہاتھ میں رکھنے والا یہ فقرہ بھی تھا؛

''میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی دانست میں کوئی غلط کام نہیں کیا''۔(57)

حیران ہوتا ہوں کہ یہ فقرہ جو کہ خواہش، تمنا یا دعا تو ہوسکتا ہے مگر مرنے کے وقت اس فقرے کو کہنا بالکل ہی الگ معنی رکھتا ہے۔

میر صاحب کی موت چوں کہ ایک عام انسان کی موت نہ تھی، اس لیے اسے ایک غیر معمولی کوریج ملی۔ اس کے انتقال کے بعد کئی ہفتوں تک ملکی وغیر ملکی ریڈیو، ٹی وی، اور اخبارات اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ پاکستان کے علاوہ غیر ممالک میں میر صاحب کے لیے تعزیتی جلسے ہوئے اور کچھ ممالک نے تو سوگ منانے کا بھی اعلان کیا۔ بلوچستان میں اُس کی موت پر ایک دن کا سوگ اور تعطیل کا اعلان کیا گیا تھا۔

31

بزنجو کی قبر

لائبریری کے عقب میں ایک جنگلے میں بلندی پہ ایک سرسبز چمن ہے، جہاں گھاس ہے، پھول ہیں۔ اور اسی چمن میں بہت ہی سادی مگر بہت ہی باوقار آرکی ٹیکچر میں بابا بزنجو کی قبر ہے۔ اُسی علاقے کا ایک سفید پتھر ہے جو سنگِ مرمر تو نہیں مگر اس کے بہت ہی قریب کی خصوصیات رکھتا ہے۔ سفید پوش بزنجو کی قبر سفید رنگ کے انھی پتھروں کی سلوں سے بنی۔ اور اِسی پتھر کی سل پر اُس کا نام لکھا ہے۔

دل کرتا ہے کہ اُس Oblisk پر ٹیگور کی یہ نظم کندہ کردوں؛

میں چاہتا ہوں کہ جو میرے دوست احباب ہیں
اُن کے ہاتھوں کے لمس سے
موت کی دنیا میں
زندگی کی بہترین نذر و نیاز لے جاؤں

لے جاؤں انسان کی آخری دعائے خیر
میری جھولی آج خالی ہے
میں نے خالی کر دیا ہے جو کچھ میرے پاس دینے کو تھا
اس کے بدلے میں اگر کچھ پاؤں............
کچھ محبت، کچھ معافی
تو اُسے ساتھ لے جاؤں گا
جب میں جیون ساگر پار کرانے والی ناؤ میں جاؤں گا
نطق سے محروم آخری جشن میں

اختتامیہ

غوث بخش بزنجو کا پاپاخ

(داغستانی زبان میں 'پاپاخ' ٹوپی/دستار کو کہتے ہیں)

میر صاحب پر تاریخ نے بہت سارے جبر کیے تھے اور ان میں سے ایک بہت بڑا جبر خود PNP کا قیام تھا۔ ایسے معاشرے میں جس کا بہت بڑا حصہ سرداری نظام کے تحت ہو، جہاں سیاست کوئی اجنبی سی چیز ہو، جہاں نہ سیاسی ادارے موجود ہوں نہ سیاسی رویے...... اس معاشرے میں سیاست کرنے اور سیاسی پارٹی (سیکولر اور جمہوری طرز پر) تشکیل دینے کا فریضہ واقعی بزنجو صاحب پر تاریخ کے جبر کا تفویض کردہ تھا۔ پاکستان نیشنل پارٹی جیسی تھی، جتنی تھی، بابا کی زندگی میں اس سے کسی کو زیادہ سروکار نہ رہا تھا۔ ان کی اپنی توپ کی سی شخصیت کے پیچھے کوئی منظر نامہ کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکتا تھا۔ اِس طرف تو بابا کی موت کے بعد لوگوں کی نظریں اٹکیں۔ بالخصوص PNP کی حکومت میں شمولیت کے بعد تو ہر چیز صاف سامنے آ گئی اور ایک بار پھر بابا کی شخصیت کی بلندی کا احساس ہونے لگا۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ اس اچھے انسان نے بہت عرصہ قبل نیشنل عوامی پارٹی بھی تشکیل کی تھی۔ وہ دیوتا تھے عوام کے لیے مگر اس سے بھی بڑھ کر دیوتا تھے اوپری طبقہ کے سیاست کاروں کے لیے۔ سب کی برائیاں، خامیاں ان کی بھاری شخصیت کے پیچھے چھپ جاتی

تھیں۔ ایک بڑی پارٹی کو قائم رکھنے کے جبر نے انھیں بہت سے ایسے شاگردوں کا استاد اور بہت سے ایسے بیٹوں کا بابا بنا ڈالا تھا جنھوں نے بزنجو صاحب کی اپنی زندگانی ہی میں انھیں پشت، پہلوؤں اور حتیٰ کہ سینے پر چاقو گھونپے تھے۔ اُف کرنا چوں کہ بزنجو کی زبان پہ کبھی نہ چڑھتا تھا، لہٰذا وہ مہان ہستی عمیق سمندر کی طرح بظاہر پرسکون رہتی تھی مگر ان کے ''اپنوں'' کو ان کی دل خراش چیخیں آج بھی سونے نہیں دیتیں، جو وہ ان کے کانوں میں کھسر پھسر کے انداز میں انڈیلتے تھے۔

بزنجو فوت ہوگیا، تو عوامی نوحے، ماتمیں اور دھاڑیں پورے لولاک نے سنیں، دیکھیں۔

ان کے جنازہ کو بہت سے لوگوں نے کندھا دیا............ ان کو Myth بنا کر 'لی جنڈ' قرار دے کر بالآخر انھیں شکست دینے کے دو سال بعد 1990ء کے الیکشن میں PNP کچھ قومی اور کچھ صوبائی نشستیں لینے میں کامیاب ہوگئی۔ بلوچ عوام بہت دلچسپ لوگ ہیں۔ کبیرہ گناہ تو کر بیٹھے تھے، اب خلش کو مٹانے والا تو رہا نہ تھا۔ چلتن کو تو خود بیلٹ بم مارا تھا۔ اب کفِ افسوس ملتے ہوئے اُن کی پارٹی کو ووٹ دینے میں امٹ رنگوں کے سیاہ دھبے تھوڑی دُھلتے ہیں۔ بزنجو کو ہرا کر شاید ہماری قوم ابد تک خود کو دکھی رکھنے کا بندوبست کر چکی تھی۔ کچھ کلہاڑی بردار جائز بھی تھے مگر بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے زندگی بھر سیاست والی کلہاڑی کو دیکھا تک نہ تھا مگر پمفلٹ اور پوسٹر والی کلہاڑی کے صدقے اسمبلیوں تک جا پہنچے۔ اسمبلی جو کہ کچھ کے لیے سفر کا معراج ہوتی ہے، کچھ کے لیے انقلاب کی حتمی منزل اور کچھ کے لیے محض ایک مرحلہ۔

اس بڑے شخص نے ایک بات کی تھی ابراہیم جلیس نگوری کی موجودگی میں، مند کے مقام پر، میر جلال خان کے مہمان خانہ میں، اسی الیکشن کے موقع پر: ''............ میں نے اپنے ایک مخالف امیدوار میر گوہر خان زرک زئی سے کہا ہے کہ میں جیت جاؤں یا ہار جاؤں لیکن قصوروار آپ لوگ ہوں گے، میں نہیں ہوں گا۔ پریشان اور پشیمان آپ لوگ ہوں گے۔ اگر میں جیت جاؤں تو لوگ کہیں گے، تم جانتے بھی تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ ملک اور قوم کی بے لوث خدمت میں گزارا ہے۔ ہم ان کو ووٹ نہ دیتے تو کس کو اور کیوں ووٹ دیتے۔ اور اگر میں ہار جاؤں تو لوگ کہیں گے کہ جس شخصیت نے پچاس سال تک اپنے آپ کو ملک وقوم کی خاطر تختہ مشق بنا کر پیش کیا

تھا تو ہم نے اس کے راستہ میں روڑے کیوں اٹکائے۔ آئندہ کے لیے کون ہم پر بھروسہ واعتبار کرے گا اور اپنے ذاتی اغراض ومقاصد کو اس طرح نظرانداز کردے گا۔'' (59)

مگر بزنجو صاحب کی پارٹی تو بہت پُھرتیلی نکلی۔ پُھرتیلے جوڑ توڑ سے ایک شخص میں درویشی، مصلحت، بزرگی اور لاتعلقی کے سارے اوصاف ڈھونڈ کر اسے وزیراعلیٰ کی صورت میں ڈھال دیا گیا اور پھر ایک بڑی سی تسبیح بنادی گئی جس میں آخری دشمنی کی آڑ میں بلوچ کش عناصر بھی پرودیے گئے، انتہائی تنگ نظر اور توسیع پسند نسل پرست لوگ بھی وہیں تھے اور سیاست دشمن سردار اور پیٹی مفادات کے حصول کے لیے بھاگنے والے سیاسی ''ورکر'' بھی آئی جے آئی کے بڑے سارے دیگ میں ڈال دیے گئے۔ لہٰذا بلوچستان میں ایک منتخب حکومت تشکیل دی گئی، یعنی ایک مطلق العنان شہنشاہ ہٹا کر سرداروں، ملاؤں، نسل پرستوں اور ضیاالحق کے مکتب فکر والے رجعتیوں کی بظاہر ایک ''غیر ضرر رساں'' سرکار تشکیل دی گئی۔

سویت یونین کیا ٹوٹا، یاروں کو ہر کارستانی کی سند مل گئی۔ لہٰذا ان کے تئیں چوں کہ ''سوشلزم ناکام ہوگیا'' اس لیے ہر سچے جذبے، سیاسی رویے اور طبقاتی بات کا مذاق اڑایا جانے گا۔ سب پارٹیاں یہی کر رہی تھیں، PNP کیوں کسی سے پیچھے رہتی؟ پاکستان نیشنل پارٹی نے نہ تو کوئی عوامی پالیسی بنائی نہ اس سے کوئی عوامی فیصلہ یا بھلائی سرزد ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی متبادل طرزِ سیاست تشکیل دیا۔ یہ پارٹی اس حکومت کا حصہ بنی جہاں ہر شعبے میں کمیشن وصولی وطیرہ بن چکی تھی اور جہاں All the relevent rules relaxed کے تحت سارے اصول، ضابطے اور قوانین تج دیے جاتے تھے۔ نسلی اور مذہبی بلیک میلنگ کے سامنے حقیر انداز میں سجدہ ریزیاں روز کا معمول بن گئی تھیں۔ سرکاری نوکریوں میں میرٹ کی بجائے دوسرے امور کو مدنظر رکھ کر تعیناتی ' تبدیلی اور ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح اداروں کی تباہی کو دوام رہی۔

بزنجو صاحب کی پارٹی بھی ان شب خونوں سے بچ نہ سکی۔ اسمبلیوں کے ٹکٹ جن لوگوں کو دیے گئے، ان کی سلیکشن میں سیاست کی بجائے مرتبت کو اولیت نصیب ہوئی۔ نظم و تنظیم نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ پارٹی کے اعلیٰ ترین عہدوں میں گڑ بڑ، گلی کوچوں کی چہ میگوئیوں کی زد میں آئی۔ کئی

سیاسی ورکر نکال باہر کر دیے گئے اور سینیٹ کا ٹکٹ اگر بقول عوام الناس کے باقاعدہ پیسوں پر فروخت نہ بھی ہوا ہو تو یہ بات حتمی ہے کہ بہت سے سیاسی لوگوں، بابا کے سفید ریش ساتھیوں اور بلوچستان کے جانے پہچانے سیاست دانوں کو قطعی طور پر نظرانداز کردیا گیا۔ علیٰ ہٰذالقیاس..........

بزنجو سیاست ہی اگر ان کی سیاسی پارٹی سے حذف کردی جائے تو پھر کیا بچتا۔ سردار، نواب، چیف ....؟ سیاسی ورکر تو مسکین کوئی صفائی بھی پیش نہیں کرسکتا تھا اپنے وزیروں اور اتحادیوں کے افعال کی۔ نہ پارٹی کا کوئی سیاسی مؤقف باقی بچا' نہ عوام سے وابستگی جاری رہی۔ اس کی کوئی تنظیم کاری تھی اور نہ اس کا کوئی سیاسی ترجمان۔ کون سی ایسی چیز تھی جسے دوسری سیاست پارٹیوں کے مقابل اعلیٰ کی حیثیت سے پیش کیا جاسکے۔

وہ ایسا ہیرو نہ تھا کہ اپنے پیچھے بندوق برداروں کے ہول ٹائمرز کا دستہ لیے چلتا۔ وہ جس قوم کو ایک جمہوری کلچر دینا چاہتا تھا، اسے آج باڈی گارڈز کی قوم میں بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس طرح اس کی موت کے چند سالوں کے اندر اندر بلوچستان کا حال اپنے ماضی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ باڈی گارڈز، وارلارڈز اور ہارسز کی منحوس تکون کی تکمیل ہو چکی ہے۔ اس تکون میں بزنجو صاحب فٹ آ ہی نہیں سکتا۔ وہ ہمارے گھڑے ہوئے ان نام نہاد ہیروؤں کی صف میں شامل ہی نہیں ہے جو ہارس تھے، ہارس رائڈر تھے یا پھر چھوٹے موٹے ہارس ٹریڈر تھے۔ صحافت، تاریخ نویسی اور دانش وری سب پر چوں کہ اوپری طبقات کا قبضہ ہے، لہٰذا انھی افراد کو ہمارا ہیرو قرار دیا گیا جو ہیرو تھے ہی نہیں اور جب بھی عوام کو معلوم ہونے لگتا کہ وہ کاغذی ہیرو تھے تو ہمارے لوکل، ڈومیسائل اور نان لوکل ہیرو ساز فوراً حرکت میں آ جاتے ہیں۔ وہ ہمارے بوسیدہ ہیروؤں کے فرسودہ مجسّموں کو ازسرنو پالش کرتے ہیں اور ایک ایسی طلسماتی فضا بنا ڈالتے ہیں کہ عوام کے اصلی ہیروؤں کے احترام کے بجائے انھی مجسّموں کی پرستش عام ہو۔

بزنجو تاریخ میں ایک بڑا فرد ہو گزرا ہے۔ اس کے نام سے اپنی شناخت وابستہ کرنے کے بہت سے فائدے ہیں، جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں مگر اس کے نام کے کچھ نقصانات بھی بہت بڑے ہیں۔ اس کے نام کا اپنا ایک ذائقہ ہے۔ ایک مخصوص خوشبو، ایک شباہت ہے اور ایک خاص

مجسمہ نظروں میں گھومتا ہے۔ اس کے حلقۂ احباب میں مخلص سیاسی ورکر، پڑھے لکھے دانش ور، ادیب، فلسفی اور صحافی ہوتے تھے۔ اس کے نام لیواؤں میں وہ چیزیں آج نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو بزنجو دشمن کھیل کے کھلاڑی ہوں، ریفری ہوں یا پھر خاموش تماشائی تاریخ کے مجرم ٹھہریں گے۔

ایک تاریخی فریضے کی تکمیل میں ہم نے یہ سطریں لکھ دی ہیں۔ ورنہ ہم جانتے ہیں کہ آج کی سرعت سے بدلتی دنیا میں اَن پڑھ، سست الوجود، جاہ طلب اور دولت کے پجاری لوگ نہ تو بلوچوں کی قیادت کے اہل ہیں، نہ نچلے طبقے کے ترجمان بن سکتے ہیں اور نہ امنِ عالم کے لیے کچھ کر سکنے کے اہل........... بڑی شخصیات کے بڑے نام صرف کچھ دن تک سہارا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کو الیکٹرانک میڈیا نے سکیڑ کر رکھ دیا۔ جھوٹ پل بھر میں نظر آتا ہے۔ مسائل بہت گھمبیر ہوتے ہیں۔ دنیا کی تبدیلیاں بہت جلد اور بار بار سیاسی لائن اور سیاسی رویوں میں نظرِ ثانی کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بلوچستان میں بزنجو صاحب کی پارٹی کو بزنجو صاحب ہی کی قائم کردہ روایات کا تسلسل برقرار رکھنا پڑتا ہے...........اور بزنجو کا پاپاخ کافی بڑا تھا، ہر سر پر شاید فٹ نہ بیٹھے۔

مگر ''جائے استاد ہنوز خالی است'' اور بزنجو کا پاپاخ ابھی تک موزوں سر کا منتظر ہے۔ تاریخی فریضہ ہے، پُر تو کرنا ہوگا، اسے پُر تو ہونا ہوگا۔

حوالہ جات

1۔ بزنجو، غوث بخش۔ انٹرویو۔ مجاہد بریلوی کی کتاب ''جمہوریت کا سفر'' میں 1987۔ پاکستانی ادب پبلی کیشنز۔ صفحہ 21

2۔ بزنجو، طاہر۔ بابائے بلوچستان۔ 1999۔ سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ۔ صفحہ 33

3۔ بزنجو، عطااللہ۔ غیر مطبوعہ انٹرویو

4۔ بزنجو، طاہر۔ بابائے بلوچستان 1999۔ سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ صفحہ 35

5- بزنجو، غوث بخش۔ In Search Of Solutions۔ پاکستان سٹڈی سنٹر یونیورسٹی آف کراچی۔ 2009۔ صفحہ 24

6۔ جمالدینی، عبداللہ جان۔ میر غوث بخش بزنجو کی یاد میں۔ ماہنامہ نوکیں دور کوئٹہ۔ 1990 شمارہ نمبر 12۔ صفحہ 69

7۔ عادل، نور محمد۔ میر غوث بخش بزنجو روزنامہ مشرق کوئٹہ، 11 اگست 1994

8۔ بریلوی، مجاہد ''جمہوریت کا سفر''۔ 1987۔ پاکستانی ادب پبلی کیشنز صفحہ 22

9- بزنجو، غوث بخش، ایڈیٹر ایم بی کٹی۔ In search of solutions۔ صفحہ 25

10۔ بزنجو، عطاءاللہ سے مصنف کا انٹرویو۔

11۔ بریسیگ، تاج محمد۔ صفحہ 209

12۔ گام گیژ۔ ماہنامہ نوکیں دور کوئٹہ۔ مئی 1992۔ صفحہ 14-15۔

13۔ نصیر، گل خان۔ تاریخ بلوچستان۔ 2000۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 464۔

14۔ بزنجو۔ غوث بخش۔ پیش لفظ گلگال، گل خان نصیر کی کتاب۔

15۔ بزنجو، طاہر۔ بابائے بلوچستان 1999۔ سیلز اینڈ سروسز کوئٹہ صفحہ 39

16۔ بزنجو، غوث بخش۔ انٹرویو روزنامہ جنگ۔ اکتوبر 1987

17۔ معصومہ حسن Bezenjo: A Warrior All His life روزنامہ ڈان کراچی 21 اگست 1989

18۔ گام گیژ۔ ماہنامہ نوکیں دور کوئٹہ۔ مارچ اپریل 1992 صفحہ 5-7

19- کاروائی دیوان عام و دیوان خاص مطبوعہ۔ از گل خان نصیر کی کتاب'' تاریخ بلوچستان۔2000۔قلات پبلشر کوئٹہ صفحہ نمبر 503۔

20۔جمالدینی،عبداللہ جان۔لٹ خانہ۔2002۔پراگریسورائٹرز ایسوسی ایشن۔کوئٹہ۔صفحہ 88

21۔ایضاً

22۔ جمالدینی،عبداللہ جان ۔ میر غوث بخش بزنجو کی یاد میں ۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان ۔ اگست 1998۔صفحہ 36

23-جمالدینی ۔ عبداللہ جان۔ میر غوث بخش بزنجو کی یاد میں۔ ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔ اگست 1998۔صفحہ 37

24۔کٹی،بی ایم۔غوث بخش بزنجو۔صفحہ 89

25۔ایضاً صفحہ 101

26۔ایضاً صفحہ 104

27۔نگوری،ابراہیم جلیس''بلوچستان کا میرِ کارواں'' ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 1991،صفحہ 14

28۔بزنجو،غوث بخش/ایم بی کٹی صفحہ 123

29۔سائیں،کمال خان شیرانی۔میر غوث بخش بزنجو۔نوکیں دور 1990،شمارہ 12،صفحہ 13

30۔نگوری،ابراہیم جلیس فرمودات بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا۔ملتان۔اگست 1995،صفحہ 11

31۔نگوری،ابراہیم جلیس فرمودات بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا،ملتان۔اگست 1995،صفحہ 12

32۔ایضاً

33۔شاہ،محمود علی۔آپ بیتی بلوچستان بیتی۔کلاسیک،دی مال۔لاہور صفحہ 100۔

34۔مالدینی،عبداللہ جان۔ششک کا مسئلہ۔نوائے وطن کوئٹہ،19 اگست 1973،صفحہ 31

35۔جمالدینی۔عبداللہ جان۔میر غوث بخش بزنجو کی یاد میں۔ماہنامہ نوکیں دور کوئٹہ۔1990۔ شمارہ 12۔صفحہ 70

36۔نگوری،ابراہیم جلیس۔فرمودات بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 1995۔صفحہ 15

37۔سائل،رحمت شاہ۔سنگین خان،رسالہ''پشتون'' جولائی 2008،صفحہ 10

38۔بزنجو،طاہر۔بابائے بلوچستان کی یاد میں۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 2005۔صفحہ 8

39۔نگوری،ابراہیم جلیس۔فرمودات بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 1995۔صفحہ 15

40۔بزنجو،طاہر۔بابائے بلوچستان۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 2008۔صفحہ 15

41۔نگوری،ابراہیم جلیس۔فرمودات بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا۔اگست 95۔صفحہ 11

42۔بزنجو،طاہر۔قومی سوال اور میر غوث بخش بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 2006۔ صفحہ 11

43۔جلیس،محمد ابراہیم۔فرمودات بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 1995۔صفحہ 10

44۔جلیس،محمد ابراہیم۔فرموداتِ بزنجو۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 1995۔صفحہ 10

45۔ بلوچ،چاکر خان۔بابائے بلوچستان۔ماہنامہ بلوچی دنیا۔ملتان۔اگست 1995۔صفحہ 33

46۔بزنجو،عطاء اللہ،ستائے ہوئے لوگ۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ 1990۔شمارہ بارہ صفحہ 80

47- بزنجو،مصدق عظیم۔میر غوث بخش بزنجو نہایت شفیق انسان تھے۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔ اگست 2006۔صفحہ 18۔

48۔بزنجو،عطاء اللہ،ستائے ہوئے لوگ۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ 1990۔شمارہ بارہ صفحہ 78

49۔بزنجو،عطاءاللہ۔ایڈیٹر کے نام خط۔ماہنامہ سنگت کوئٹہ ستمبر 2008

50۔سلمیٰ احمد SAMA-2000-Cutting Free،کراچی۔صفحہ 12

51- بگٹی،عزیز۔بابائے بلوچستان۔ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 1995۔صفحہ 34

52۔مینگل،عاقل خان۔بلوچستان ءِ بابل بزنجو۔ماہنامہ نوکیں دور کوئٹہ۔1990 شمارہ نمبر 12 صفحہ 25

53-طاہر،بزنجو،قومی سوال..........بلوچی دنیا۔اگست 2006۔صفحہ نمبر 6

54- بزنجو، طاہر۔ بابائے بلوچستان ءِ زندءِ گڈی روش۔ ماہنامہ بلوچی کوئٹہ۔ اکتوبر 1989۔ صفحہ 11

55۔مجھ سے محمود خان اچکزئی کی گفتگو

56۔گنگوفسکی، یوری، حوالہ طاہر بزنجو''بابائے بلوچستان'' 1990 ۔ پاکستانی ادب پبلی کیشنز کراچی۔صفحہ 32

57-بزنجو،غوث بخش،ماہنامہ بلوچی دنیا ملتان۔اگست 2006۔صفحہ 6